سہ ماہی

موجِ خیال

جولائی
2026

ابنِ صفی نمبر

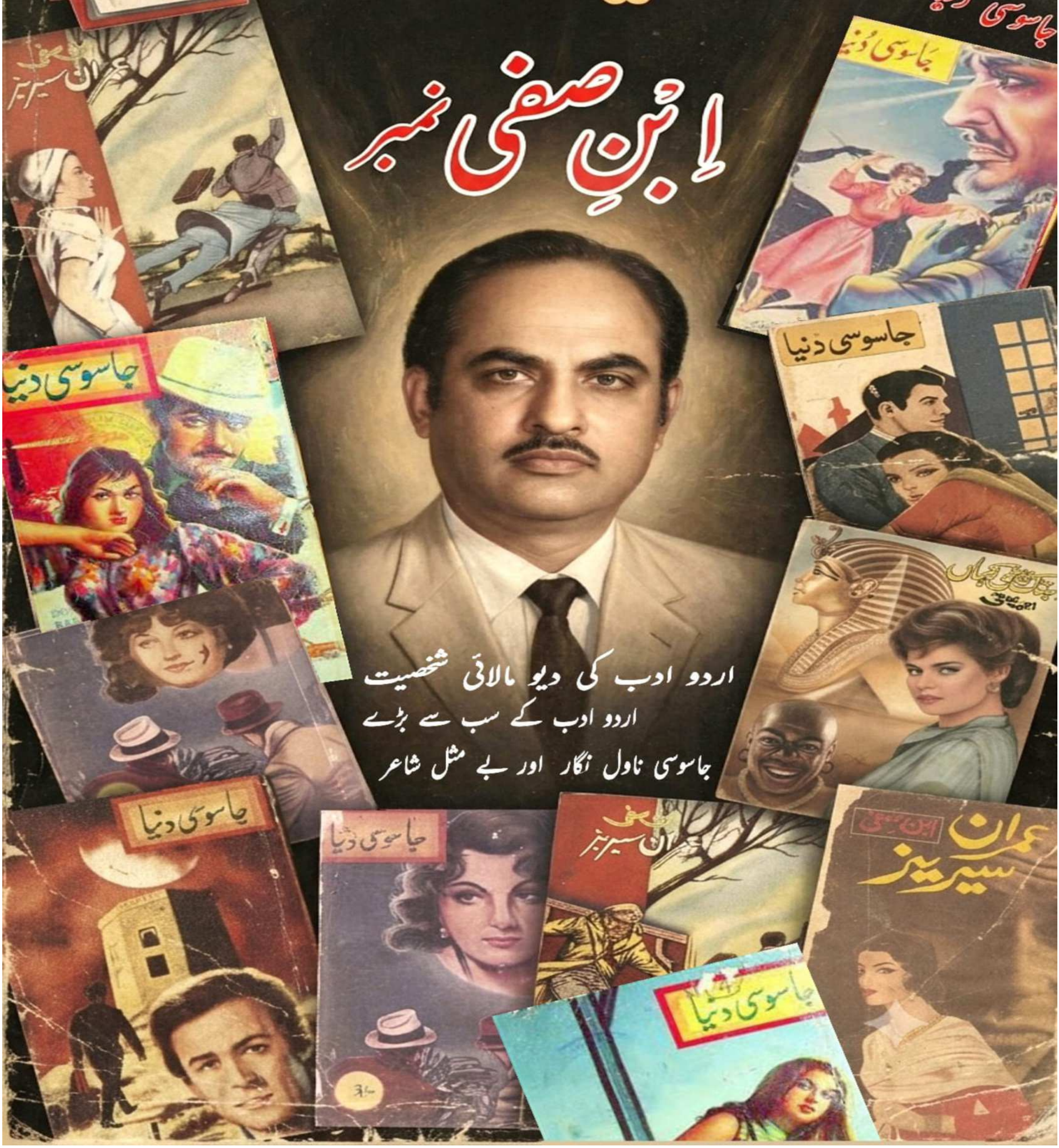

اردو ادب کی دیو مالائی شخصیت
اردو ادب کے سب سے بڑے
جاسوسی ناول نگار اور بے مثل شاعر

سہ ماہی

موج خیال

زیر سرپرستی
شکور پٹھان

مدیر اعلیٰ
تبسم حجازی

مدیر
مرزا صہیب اکرام

مجلس مشاورت
شگفتہ شاہ کاظمی، پروین شفف، رخسانہ نازنین، خواجہ کوثر حیات

تزئین و ترتیب
محمد معین یوسف

سرورق
آکاش مغل

سوشل میڈیا انچارج:
عبیرہ غوری حنان

فہرست

- ادار یہ

باب اول۔ صفی گھرانہ

ابرار احمد سے انٹرویو

- شکاریات اسرار-احمد صفی
- ذکر اسرار-ثروت اسرار

باب دوم- سخن در سخن

- فخر الدین کیفی صدیقی۔حیدرآباد
- محمد حنیف۔حیدرآباد
- تبسم حجازی-امریکہ
- انور ظہیر- جرمنی
- شگفتہ کاظمی۔حیدر آباد
- حمیرا ثاقب-فیصل آباد
- سمیرا عابد۔ اسلام آباد
- کرن صدیقی۔کراچی
- شہلا شکور-اسلام آباد
- طاہر انجم صدیقی۔ مالیگاوں
- عزم الحق۔فیصل آباد
- فراز علی حیدری۔کراچی
- فائزہ احمد۔ ناگپور
- حمزہ حسینی۔لکھنو
- عنقا سدید-بھوپال

باب سوم۔ نقش صفی

- عہد صفی — شکور پٹھان
- راہِ سخن میں تھا وہ یکتا — ادریس شاہ جہاں پوری
- ابن صفی کو نہ پڑھا ہوتا — شگفتہ شاہ
- ابنِ صفی کے ناولوں میں سائنسی شعور اور منطقی طرزِ فکر — کوثر حیات
- کشاکش اسرار و صفی — تبسم حجازی / مرزا صہیب اکرام
- ابن صفی تک کا سفر — عبیرہ غوری
- ابن صفی کی کردار نگاری اور منظر نگاری — فخر الدین کیفی
- تزک دو پیازی — عبداللہ ندیم
- ابن صفی کے علامتی کردار — مرزا صہیب اکرام

اسرار ناروی

- غزل اور نظمیں

چلتے ہو تو راستے بول اٹھتے ہیں

- حیدر آباد کا سفر — رخسانہ نازنین

باقی سب افسانے ہیں!

- رکا ہوا فیصلہ — شاہین کمال
- عہد و پیمان — سرور غزالی
- تین ناری تین کتھائیں — شکور پٹھان
- ٹاور — محمودہ قریشی
- 4 جولائی — محسن علی

شاعری سچ بولتی ہے

- غزلیں
- پروین شغف
- تابش ردولوی
- سارہ سید
- حرا قاسمی

السلام علیکم

ہمارے اور آپ کے رشتے کو سال ہو گیا ہے۔ گرمیوں سے گرمیوں کا سفر کیسا رہا یہ تو آپ قارئین بتا سکتے ہیں۔ گرانی اور مندی کے اس دور میں ہم کسی نہ کسی طرح رسالہ آپ تک بروقت پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے رسالہ کی سالگرہ ہے یعنی یہ جناب بھی بڑے ہو رہے ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ ابن صفی صاحب کا مہینہ بھی جولائی ہے۔ اس وجہ سے ہم اس بار لائے ہیں خاص نمبر، یعنی ابن صفی نمبر۔ یہ سال میں پہلی بار خاص نمبر آیا ہے۔ اس میں کیا کیا چھپا ہے کون کون سے لکھاری اور قلم کار اس بار ابن صفی کی محبت میں اس کا حصہ بنے ہیں۔ یہاں ان کا تذکرہ کروں تو الگ سے مضمون بن سکتا ہے جب کہ ہمارے پاس پہلے سے صفحات کی قلت ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں کہ پی ڈی ایف اور آن لائن رسالے میں بھی صفحات کا رونا کیونکر۔۔۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ہمیں خیال کرنا پڑتا ہے کہ صفحات اتنے کم نہ ہوں کہ تنگی داماں کا گلہ کریں اور اتنے زیادہ بھی نہ ہوں کہ اکثر پڑھنے والوں کے موبائل اور لیپ ٹاپ فائل کا قد کاٹھ دیکھ کر دبک جائیں۔ اگرچہ آئی فون کا دور ہے لیکن اکثر قاری اینڈرائڈ والے بھی ہیں تو ہم صفحات کی تعداد کو کنٹرول میں رکھتے ہیں۔ آپ سوچ رہے ہوں کہ اتنا رونا وہ بھی مفت کے صفحات کا۔ تو خوشی کی خبر سنیں یہ رسالہ آن لائن اور پی ڈی ایف کے بعد باقاعدہ چھپ بھی رہا ہے۔ ہم اپنے سب ہی لکھنے والوں کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے ابن صفی کے حوالے سے لکھا، ہمارے سوالات کے جواب دئے بطور خاص خانوادہ ابن صفی کا شکریہ جنہوں نے اپنا وقت نکال کر ہمارے رسالہ کے لئے تحریر بھیجی۔۔ یہ خاص نمبر کتنا خاص الخاص ہی یہ آپ اسے پڑھ کر دیکھیں۔ اپنی تعریف آپ کرنا مناسب نہیں لگتا۔ تعریف و توصیف اور تنقید قارئین کا حق ہے ان پر چھوڑتے ہیں۔ پڑھیئے اور بتائیے کہ ہم اس بار کہاں تک کامیاب رہے۔ خیر اندیشوں کا ٹولہ

ٹیم موجِ خیال

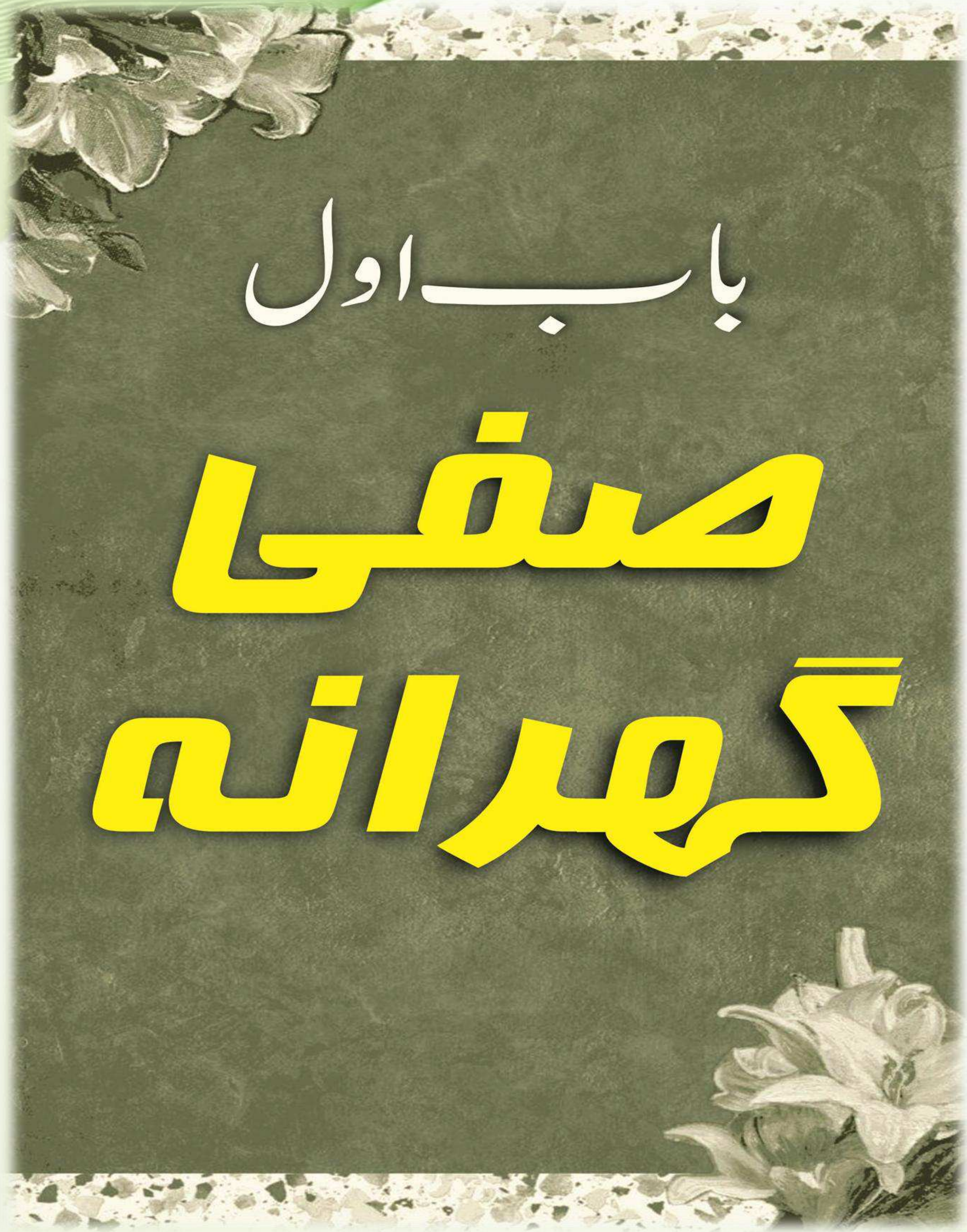
باب اول
صفی
گھرانہ

1۔ابن صفی کی زندگی کا وہ کون ساواقعہ ہے جس نے ان کی شخصیت یا سوچ پر سب سے گہرا اثر ڈالا؟

جواب : میرا خیال ہے کہ وہ چیلنج جو انہوں نے اردو ادب کے حوالے سے قبول کیا، کہ اردو ادب میں، جذباتی اور جنسیاتی عنصر سے گریز کر کہ بھی کچھ لکھا جا سکتا ہے، جو کہ تعمیری اور تعلیمی عنصر بھی رکھتا ہو، اسی لیے وہ اپنے قلم اور ذہن کو یکسر تبدیل کر کے، صرف تعمیری اور تفریحی مکالمے کی تخلیق میں جٹ گئے

2۔لکھنے کے علاوہ ان کا پسندیدہ مشغلہ کیا تھا اور اس کا ان کی تحریروں پر کیا اثر پڑا تھا؟

جواب : جو ہم نے دیکھا وہ یہ کہ وہ لکھنے کے وقت کے علاوہ اپنا وقت گفتگو اور لوگوں سے ملنے میں گزارا کرتے، مختلف الخیال لوگوں میں وہ بحد مقبول تھے، چاہے وہ کسی علم معیار کا ہو جیسے محبوب نرالے عالم جو گلی گلی گھوم کر چنا جور بیچا کرتے تھے، انکی ذہنی اپج کی وجہ سے وہ ناولوں کا زندہ کردار بن گئے،، وہیں ابوالخیر کشفی، رئیس امروہوی، سلیم احمد، مشہور تاریخی محقق شاہد منصور بھی ان کے حلقے دوستی میں شامل تھے ان سب ہی کی گفتگو سے ان کو لکھنے کی تحریک ملتی تھی۔

3۔ آپ ابن صفی کی روزمرہ زندگی میں کس عادت سے متاثر تھے اور کیا آپ نے اسے اپنایا؟؟

جواب۔ ان کی عادت جو کہ جو پہلے بھی عرض کی، حلقہ احباب،، میرے بھی خلقہ احباب میں متنوع الخیال لوگ موجود ہیں،،، جن کی گفتگو مجھے کبھی کبھی اپنے سوچنے کہ انداز میں بہتری کی راہ دکھاتی ہے۔

4۔گر ابن صفی مصنف نہ ہوتے تو کس پیشے کا انتخاب کرتے؟

جواب: اگر ابن صفی ادیب نا ہوتے تو اک معیاری اور مشہور ارٹسٹ ہوتے۔

5۔ابن صفی کی زندگی کی سب سے یادگار کتاب کون سی تھی جس نے انہیں انسپائر کیا تھا؟؟

جواب :ابن صفی کو کون سی ناول پسند تھی یہ کہنا مشکل ہے کیونکہ اک ادیب کی زندگی میں اسکی تخلیق ہی اسکی اولاد کی طرح ہوتی ہے اور وہ کس کو زیادہ چاہتا ہے یہ کہنا مشکل ہے، مگر میرے نزدیک،ڈیڑھ متوالے اک ایسا ناول ہے جسمیں معاشرتی گتھیوں نفسیاتی تال میل زیادہ نمیاں ہے اور اس میں جسطرح ان باتوں کو آسان پیرائے میں سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ کمال ہے۔

6۔ابن صفی تنہا رہنا پسند کرتے تھے یا لوگوں کی محفل میں ؟؟

جواب: ابن صفی اک کھل مل جانے والی شخصیت تھی وہ کبھی بھی تنہائی پسند نہیں تھے،وہ دوستوں کیساتھ نا ہوں تو پھر ہمارے ساتھ ہوتے تھے کبھی کبھی ہماری گفتگو بھی ان کے ناولوں کے مکالمے بن جاتے۔

7۔جب ابن صفی پریشان ہوتے تو کیا کرتے ؟کسی سے مشورہ کرتے اور دلاسہ لیتے ؟؟..

جواب: جب تک دادی زندہ تھیں وہ کبھی الجھتے تھے تو صرف دادی سے گفتگو کرتے تھے۔ان کے انتقال کے بعد وہ کبھی کبھی شام کی چائے کے دران اپنی پریشانی کو اک واقعہ بنا کر ہم سب بھائی بہنوں کے سامنے رکھتے۔اور پھر کھل کر ہم سب مچھلی بازار بنا ڈالتے۔کچھ دیر میں وہ مسکرا کر اٹھ جاتے۔۔اب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اس شور شرابے میں اک مکمل حل ڈھونڈ لیتے تھے۔

8۔ اگر ابن صفی کو موقع ملتا تو ماضی یا حال کی کس شخصیت کے ساتھ ایک شام گزارنا چاہتے ؟

جواب : ابن صفی اسوقت یعنی جب وہ زندہ تھے سبھی لوکوں سے رابطے میں تھے۔اگر ماضی کے لوگوں کی بات کی جائے،تو جیسا میں نے سمجھا اور جانا،،شاعروں میں میراجی،غالب،اور میر کے ساتھ کرتے اور اگر مفکروں کی بات کی جائے تو علامہ اقبال کیساتھ بھی شام گزارتے۔۔

9۔اپنے سب ہی بچوں میں وہ سب سے زیادہ کس سے قریب تھے ؟

جواب : وہ سب کے قریب تھے مگر بہنوں کو زیادہ فوقیت دیتے تھے۔ہم بھائی ان کے ساتھ مکالمہ زیادہ کرتے زندگی کے پہلوؤں پر بات چیت اور سوال یا کسی بھی موضوع پر چار مختلف آرا۔۔

10۔بچپن میں ان کے ساتھ کی گئی کوئی ایسی شرارت یا کوئی خوب صورت یاد جو آج بھی آپ کے چہرے پر مسکراہٹ لے آتی ہے ؟

جواب : ان کے ساتھ شرارت کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے تھے،بس ان کے بٹوے چھالیہ چرانے کی بے ضرر سی شرارت کے علاوہ کچھ اور نہیں کیا۔

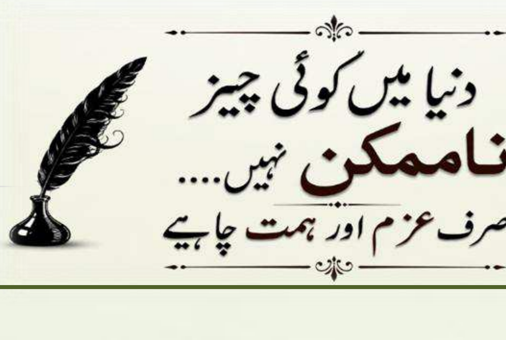

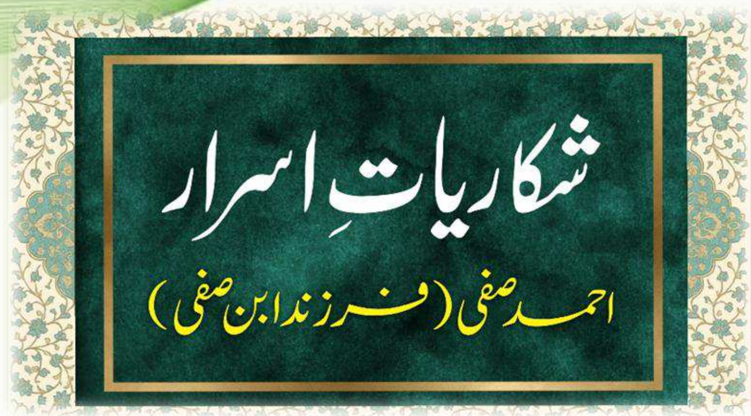

قصبہ نارا ضلع الہ آباد کا ایک
زرخیز علاقہ ہوا کرتا تھا۔۔ اجناس کی پیداوار میں بھی اور مردم خیزی میں بھی۔ اکثریتی پیشہ کاشتکاری اور زمینداری تھا۔ یوپی کے دیگر علاقوں کی طرح یہاں بھی زمیندار سیر وشکار کے خوب شوقین ہوا کرتے تھے۔ یہی ماحول تھا جس میں اسرار احمد صاحب نے پرورش پائی اور بعد میں اسرار ناروی اور ابن صفی کے قلمی ناموں سے نظم ونثر کے میدانوں میں شہرت حاصل کی۔

ان کے علمی اور ادبی کاموں کے چرچے میں ان کے شوقِ شکار کا ذکر کہیں دب کر رہ گیا۔۔ لیکن ان کی تصنیفات کے قاری اس کی جھلک مسلسل تحریروں میں پاتے رہے۔۔ شکار گاہوں کے تذکرے، شکاریوں کی مہمات اور شکار کے قصے ان کی جاسوسی اور غیر جاسوسی کہانیوں میں جابجا بکھرے نظر آتے ہیں۔

نارے میں ایک تالاب گمبھیا نام کا اب بھی ہے۔ ابو اور ہمارے چچا جناب غلام کبریا صاحب مرحوم وہاں پر لڑکپن کے شکاروں کے قصے سناتے تھے۔ علاقے کے رئیسوں مثلاً نوح ناروی صاحب کے سیر وشکار کے قصے بھی ان کی یادداشتوں اور ان سے متعلق لوگوں کی یادوں کا حصہ ہیں۔۔۔ ہماری پھوپھی مرحومہ بلاغت خاتون (عذرا ریحانہ) ایک تذکرے میں لکھتی ہیں :

"بھائی جان کو شکار کا شوق زمانہ طالب علمی سے تھا۔ اس بارے میں بھائی جان نے خود بڑا دلچسپ واقعہ سنایا کہ ایک بار دسہرے کی چھٹیوں میں وہ دادی کے پاس نارہ چلے گئے۔ وہاں اپنے ایک کلاس فیلو کے ہمراہ شکار کا پروگرام بنا کر نکل کھڑے ہوئے۔ جاتے ہوئے دادی نے تاکید کی کہ مغرب سے پہلے واپس آجانا لیکن واپسی میں تاخیر ہوئی اور عشاء کا وقت ہو گیا اور یہ بھی عجب اتفاق تھا کہ اس دن ایک بھی پرندہ شکار نہ کر سکے۔ بھائی جان کو اچھی طرح علم تھا کہ دادی سے زبردست ڈانٹ پڑے گی اور ہوا بھی یہی۔ بھائی جان مسکین صورت بنائے کھڑے رہے اور جیسے ہی وہ سانس لینے کے لیے رکیں فوراً ہی اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کے لیے بولے بس اج تو اللہ نے ہماری جان بچا لی۔ بھائی جان نے کسی قدر خوفزدہ ہو کر بتایا کہ ہم نے بہت سے پرندے شکار کیے

اور جب گھر آنے لگے تو ذبح کیے ہوئے سارے پرندے پھڑ پھڑا کر اڑ گئے۔ میری اور میرے ساتھی کے خوف سے بری حالت تھی۔ اتنا سننا تھا کہ دادی کا سارا غصہ فرو ہو گیا اور بے چارہ فوراً صدقہ خیرات میں لگ گئیں۔"

ابو کا یہ مرغ وماہی کے شکار کا شوق پاکستان آنے کے بعد بھی کم نہ ہوا اور وہ بدستور دوستوں کے ساتھ ان مہمات پر جاتے رہے۔ ہمارے بچپن کی یادوں میں ان کا شکار سے واپس آنا اور ہاتھ میں جل مرغیوں، مرغابیوں اور چھوں کا تحفہ لٹکتا ہوا شامل ہے۔ آپا (ہماری امی) کے لیے یہ ایک اضافی کام ہوتا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ ان مرغابیوں کے پر اتارنا اور ان کی صفائی کرنا کتنا بڑا کام ہوتا رہا ہوگا۔ آبی پرندوں کے کچے گوشت کی بساند کو برداشت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اس پر سے آلائشوں کی صفائی۔ الامان الحفیظ۔ لیکن پھر اس صفائی کے بعد آپا اس پر مصالحہ جات کا استعمال کچھ ایسا کرتی تھیں کہ بساند بھی غائب ہو جاتی تھی اور پکنے کے بعد ذائقہ ایسا کہ شکاری بھی انگلیاں چاٹتے رہ جاتے تھے۔ ایک مدھم سی یاد اس طعام کی وہ باریک باریک چھرّے تھے جو گوشت میں پیوست ہوتے تھے اور کھاتے ہوئے دانتوں تلے آجاتے تھے۔۔۔ کارتوسوں میں یہی چھرّے ہوتے تھے جو شکار کے جسم میں گھس کر اسے گھائل کرتے تھے اور اتنا وقت مل جاتا تھا کہ شکار ان تک پہنچ کر حلال کر سکے۔ آپا اور ابو کی مسلسل تنبیہہ ہوتی تھی" چھرّے دیکھ کر کھانا "! یہ ایسا ہی تھا جیسے مچھلی کھاتے ہوئے کانٹوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

کارتوسوں کا تذکرہ آیا تو ابو کی روسی ساخت کی بارہ بور ڈبل بیرل گن بھی یاد آ گئی۔ اس کا میک اور ماڈل بیکال شاید آئی جے 58 تھا۔ س کی دونالیاں ہوتی تھیں اور دو ہی لبلبیاں یعنی ٹریگرز بھی۔ ابو کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے ایک کارتوس فائر کرتے تھے اور اس کے کچھ ہی ثانیے بعد دوسرا فائر کرتے۔ ان کے دوست اس پر ان سے کہتے کہ دونوں ایک ساتھ فائر کیا کرو۔ انہوں نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ ایک فائر کے بعد پرندے ہڑبڑا کر اڑتے ہیں اور قلیل سے انتظار کے بعد کیے جانے والا دوسرا فائر ان میں سے ایک بڑی تعداد کو ڈھیر کر دیتا ہے۔ یہی طریقہ جاسوسی دنیا کے ناولوں میں کرنل فریدی کو استعمال کرتے بھی دکھایا گیا ہے۔ کوئی حافظِ فریدی شاید اس کا حوالہ راقم سے پہلے ہی نکال کر کے آئے۔ یہ بندوق ان کے انتقال کے بعد ایک اسلحہ ڈیلر کے پاس امانتاً جمع کروائی گئی تھی کیونکہ مارشل لاء کے دور میں ایسا اسلحہ گھر سے برآمد ہونا خطرناک ہو سکتا تھا جس کا لائسنس ہولڈر انتقال کر چکا ہو۔ مزید تفصیلات ہمارے بڑوں ہی کے پاس ہوں گی۔

پاکستان میں ابو کے شکار کے ساتھی بہت سے تھے۔ ان میں قابلِ ذکر جناب جان عالم چچا مرحوم اور جناب سید احمد جوہر دہلوی شامل تھے۔ جان عالم چچا سے دوستی بہت پرانی تھی اور تمام تر بے تکلفی کے باوجود جان عالم چچا ابو کو اسرار صاحب کہہ کر مخاطب کرتے اور آپ جناب سے بات کیا کرتے تھے۔ سید احمد جوہر دہلوی کی جوہر مارکیٹ میں ابو کا آفس تھا۔ ان کے والد علامہ سید محمد دہلوی صاحب ابو کو بیٹوں کی کی طرح چاہتے تھے۔ جوہر چچا کے صاحبزادگان بھی شکار کے شوقین تھے اور ان کے پاس جیپیں تھیں جن پر یہ قافلہ وار شکار پر جایا کرتے تھے۔ عموماً ان کی منزلیں سندھ کی جھیلیں، دریا،

شکار گاہیں اور ندیاں ہوتی تھیں جہاں پرندے اور میٹھے پانی کی مچھلیاں سیزن میں بہتات سے ملتی تھیں۔ ابو اور ان کے احباب شکار صرف اجازت یافتہ سیزن ہی میں کیا کرتے تھے اس کی کبھی خلاف ورزی نہیں کی۔

ابو میں شکار کا شوق ان کے بڑوں ہی سے آیا تھا۔ ابو کے ایک چچا وصال احمد صاحب مرحوم (جنھیں ہم سب مُنّا بابا کہتے تھے) ابو کے انتقال کے بعد بھی ایک عرصے تک حیات رہے۔ مچھلی کے شکار کے ماہر تھے۔ بڑھاپے میں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ اندرون سندھ مچھلی کے شکار پر جاتے تھے اور خوب مچھلی لے آتے تھے۔ ابو ان سے کہا کرتے تھے کہ اب آپ اتنی مچھلی نہ کھایا کریں کیونکہ ان کو گرمی دانے بہت نکلتے تھے۔ سرخ و سفید چہرہ مزید سرخ ہو جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ مچھلی کے شکار کا مقابلہ ہوا جس میں ابو بحیثیت مہمانِ خصوصی مدعو کیے گئے۔ غالباً حب ندی پر یہ مقابلہ منعقد کیا گیا۔ درجنوں شکاری شریک ہوے۔ منا بابا نے اپنے سیکریٹ ایکس فارمولے سے مچھلی کا چارہ بنایا اور کانٹا ندی میں ڈالا... اب جو مچھلی پھنسی اس نے منا بابا ہی کو ندی میں کھینچنا شروع کر دیا۔ لوگ جمع ہو گئے۔ منا بابا اور مچھلی میں کانٹے کا مقابلہ شروع ہو گیا۔۔ ان کی ایڑیاں گیلی ریت میں دھنسی تھیں اور خود کچھ یوں ٹیڑھے ہو چکے تھے کہ ایڑیاں آگے اور پورا جسم پیچھے کی طرف اکڑا ہوا تھا۔ اسی عالم میں ندی کی سمت کھنچ رہے تھے۔ اچانک جان عالم چچا نے ایک جال لے کر جمپ ماری اور مچھلی کو قابو کر لیا کہ بڑا شکار نکل نہ جائے اور کہیں منا چچا کو بھی ساتھ ہی نہ لے جائے۔ مچھلی ہار گئی اور اسے نکال لیا گیا۔ لیکن منا بابا ڈسکوالیفائیڈ ہو گئے کیونکہ بیرونی امداد کے ساتھ مچھلی پکڑی۔ افسوس دگنا تب ہو گیا جب پکڑی جانے والی مچھلیوں میں سب سے بھاری یہی مچھلی نکلی مگر ابو سے انعام دوسرے نمبر والے شکاری لے گئے۔ منا بابا جب تک حیات رہے جان عالم چچا سے اسی بات پر ناراض رہے۔ اللہ ہر دو بزرگوں کو اپنی رحمت کے سائے میں رکھے۔ آمین

یہ تو ہوئی پچھلی پیڑھی کی بات اگلی نسل کو بھی ابو نے اس شوق کی طرف راغب کیا۔ ابّا (دادا صفی اللہ صاحب) کی مضبوط جرمن ائیر گن ڈائنا 35 نمبر بھی ہم لوگوں کے حوالے کر دی تھی۔ یہ گن اتنی دور مار تھی کہ ایوب خان کی حکومت میں اس پر رائفل ہی کی طرح لائسنس ہوا کرتا تھا۔ اس سے ابرار بھائی اور ہم نے پرندوں کا شکار کر رکھا تھا۔ شرط یہی تھی کہ وہ پرندہ مت مارو جسے ذبح کر کے حلال نہ کر سکو۔ میں پانچویں جماعت بورڈ کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن سے پاس ہوا تو نسبتاً چھوٹی ڈائنا 16 نمبر ائیر گن بطور انعام ابو نے مجھے دی۔ اور پھر چھوٹے چھوٹے شکار کے دوروں پر بھی لے جاتے رہے جو ملیر، ڈملوٹی اور آس پاس کے مقامات تک تھے۔

مجھے نشانہ لگانا بھی انہوں ہی نے سکھایا اور مجھے امید ہے کہ آج بھی شست باندھ کر نشانہ لوں تو گولی کو حدف تک ضرور پہنچا دوں گا۔ انہوں نے ڈائنا بندوق کی نالی کے اگلے سرے پر لگی ہوئی کیل دکھا کر بتایا تھا کہ یہ مکھی ہے۔۔۔ بندوق کی نال کے دوسرے سرے پر ایک ننھی سی پلیٹ تھی جس میں ایک چھوٹی سی نوچ کٹی تھی۔ نشانہ یوں باندھو کہ مکھی نشانے کی سیدھ میں ہو اور اس نوچ میں سے مکھی کی نوک نظر آ رہی ہو۔ پھر فائر کرنے سے پہلے

بندوق کو نشانے سے کچھ اوپر کر لو۔۔۔ کیونکہ گولی سیدھی نہیں جاتی بلکہ کشش ثقل سے نیچے کو دبتی ہے۔ اوپر کرنے سے یہ عین نشانے پر جا کر بیٹھے گی۔ اور پھر ابو کو کبھی ہماری نشانے بازی سے مایوسی نہیں ہوئی۔

بندوقوں کے اس شوق سے آپا کو زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ آتشیں اسلحے سے گھبراتی تھیں۔ اور درست گھبراتی تھیں۔ کم از کم ایک واقعہ تو ایسا ہوا تھا کہ جس سے سب پریشان ہو گئے تھے۔ میری ڈائنا 16 نئی نئی آئی تھی، اس کے ساتھ چھرّوں کا ایک ڈبہ بھی ملا تھا۔ اتفاق سے یہ چھرے اسی سائز کے تھے جو ڈائنا 35 نمبر میں بھی چل سکتے تھے۔ میں اور بھیا ابرار نشانہ بازی کر رہے تھے۔ بھیا کے چھرے ختم ہو گئے تو وہ کھلی ہوئی گن لے کر مجھ سے۔ چھرے مانگنے پہنچے۔۔۔ میں نے نخرے دکھانے شروع کیے۔ کھلی ہوئی گن یں چھرے ڈالنے والی جگہ کو انگلی سے ٹٹول کر کہنے لگا اس میں میرے چھرے نہیں آئیں گے۔ ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ کسی طرح لبلبی دبی اور ڈائنا 35 ایک جھٹکے سے بند ہو گئی۔ میرے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کا ناخن اور اگلا حصہ اسی میں کٹ کر پھنس گیا۔ میری چیخ سن کر ابو دوڑے۔۔۔ گن کھولی تو ایک فوارہ خون کا جاری ہوا۔ بعد کی داستان طویل ہے۔۔۔ ایک عرصہ علاج کے بعد تین چوتھائی انگلی ایک بے تکے ناخن کے ساتھ ہاتھ میں موجود ہے مگر تشہد کا کام بخوبی کر لیتی ہے الحمدللہ۔

ابو کی شکاریات کے تین نسلوں پر پھیلے یہ واقعات وہ ہیں جو میری دھندھلاتی یادداشت کا حصہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ابو کے دوستوں، بزرگ رشتے داروں اور میرے بہن بھائیوں کے پاس ایسے اور بہت سے واقعات بھی ہوں گے جو شاید پھر کبھی قلمبند ہو سکیں۔ میں بھی منتظر ہوں آپ بھی انتظار کیجیے۔

نوٹ: اس مضمون کے ساتھ کچھ دستاویزات کی تصاویر ہیں جو اس سے قبل میں شریک نہیں کی گئیں۔

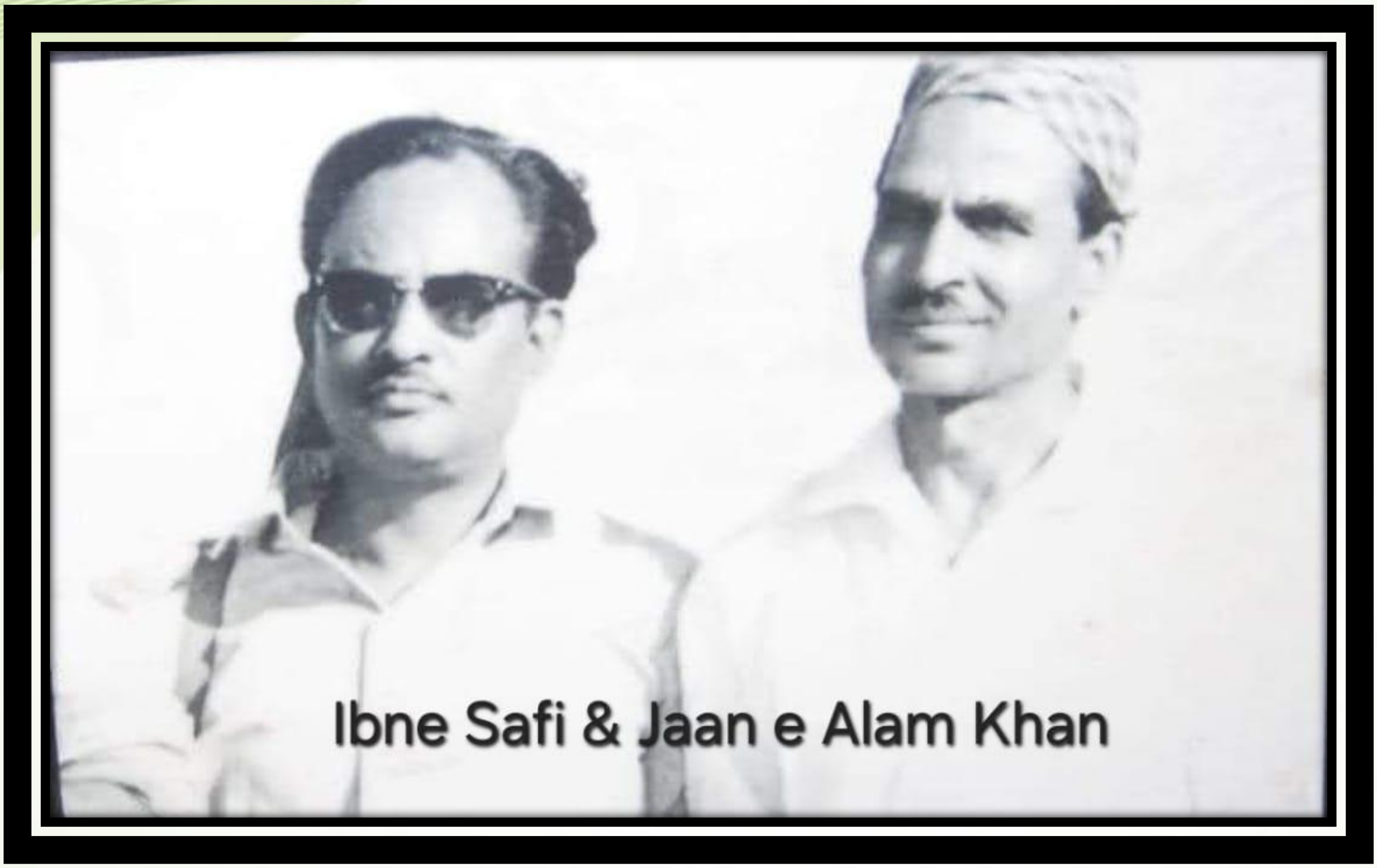
Ibne Safi & Jaan e Alam Khan

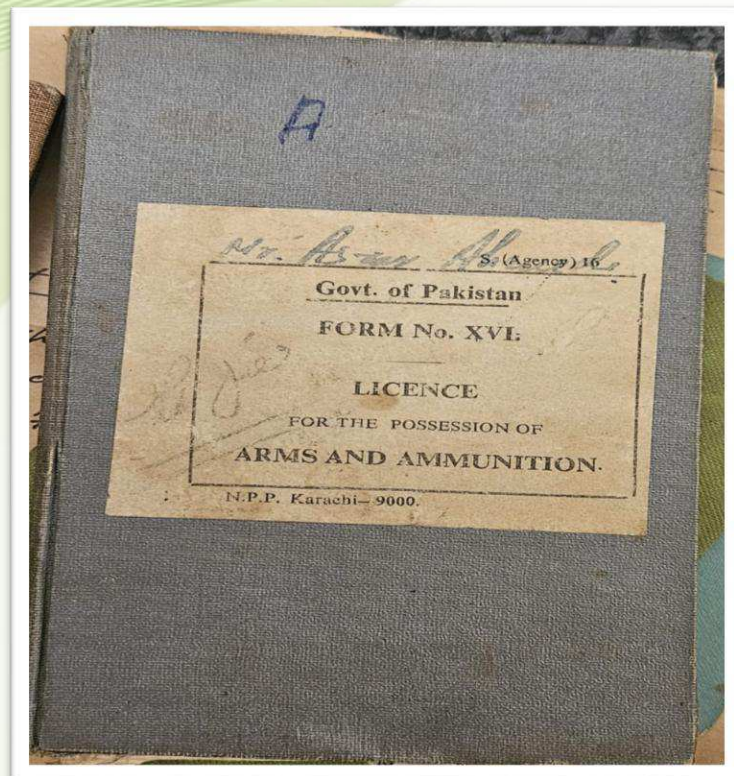
S. (Agency) 16
Govt. of Pakistan
FORM No. XVI.
LICENCE
FOR THE POSSESSION OF
ARMS AND AMMUNITION.
N.P.P. Karachi—9000.

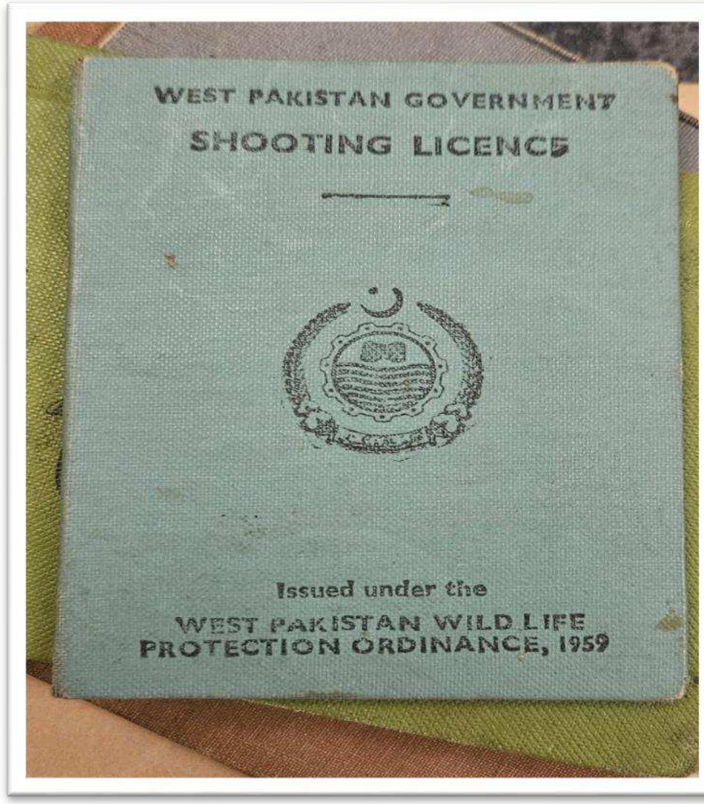
WEST PAKISTAN GOVERNMENT
SHOOTING LICENCE
Issued under the
WEST PAKISTAN WILD LIFE
PROTECTION ORDINANCE, 1959

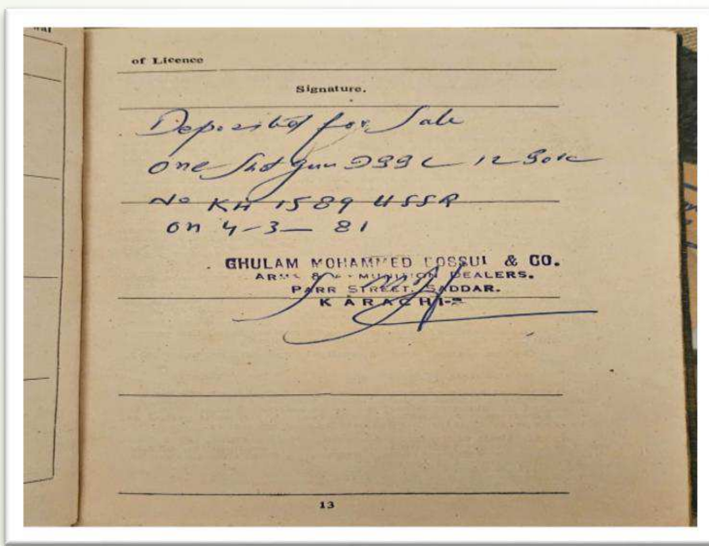
of Licence
Signature.
Deposited for Sale
on 4-3-81
PARR STREET, SADDAR.
KARACHI
13

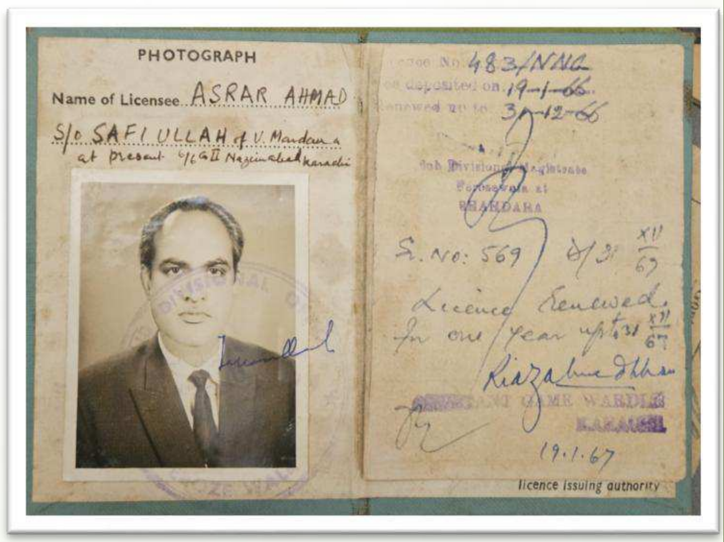
PHOTOGRAPH
Name of Licensee ASRAR AHMAD
S/o SAFI ULLAH
S. No: 569
Licence Renewed
19.1.67
licence issuing authority

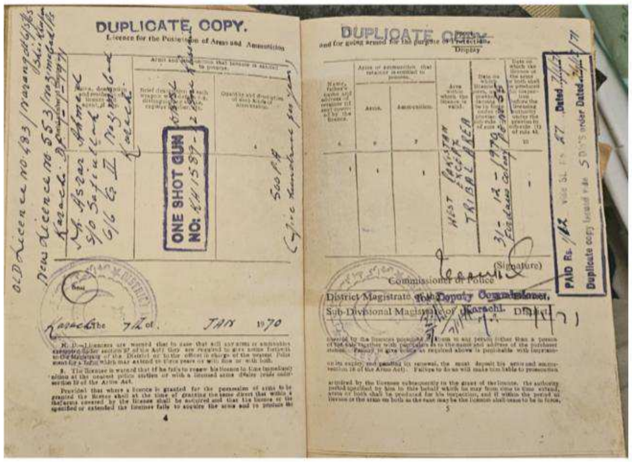
DUPLICATE COPY.
ONE SHOT GUN

Baikal IJ 58
Double Barrel 12 Bore
made in USSR

Diana 16 Airgun

Baikal Shotgun with Cartridges

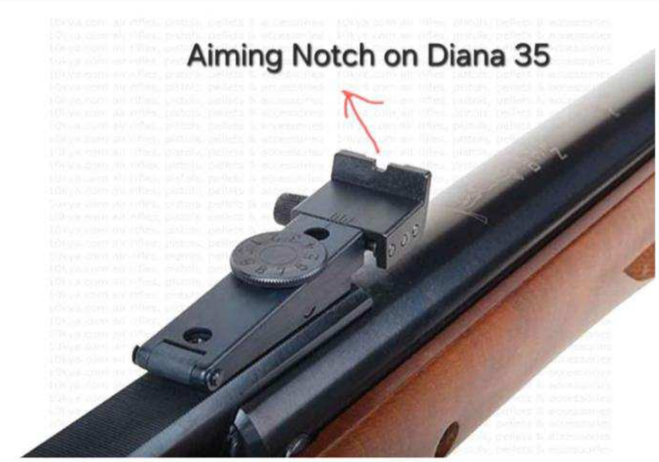
Aiming Notch on Diana 35

DIANA
MOD. 35
Diana 35 Airgun

Diana 35 Airgun

تذکرہ اسرار

ثروت اسرار (دختر ابن صفی)

کل میں اپنی بیٹی کو اپنے پاپا سے مختلف موضوعات پر بات کرتے سُن رہی تھی۔ اُس وقت مجھے خیال آیا کہ ہم سب بہن بھائی بھی اپنے ابو سے اسی طرح ہر موضوع پر بات کر لیتے تھے۔ اُس زمانے میں خاص طور پر، ہم اپنے ارد گرد دیکھتے تھے کہ بچے اپنے والد کے گھر آتے ہی وہاں سے اُٹھ کے چلے جاتے تھے کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے ورنہ ڈانٹ پڑے گی۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے ابو نے کبھی ہم لوگوں کو اور خاص طور پر بیٹیوں کو کبھی نہیں ڈانٹا۔ ہمیشہ لڑکیوں کو یہ سمجھاتے رہے کہ تعلیم صرف لڑکوں کے لئے ہی اہم نہیں ہے بلکہ لڑکیوں کے بھی اُتنی ہی ضروری ہے۔ وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ ہم بہنوں کو بھی اچھے اسکولوں میں داخلہ ملے۔ ہاں یہ ضرور کہتے تھے محنت کر کے پاس ہونا ہے تاکہ بغیر کسی سفارش کے داخلہ ہو سکے۔

امتحانات کے زمانے میں روز پوچھتے تھے کہ کل کس مضمون کا امتحان ہے۔ اگر مدد کی ضرورت ہو تو کتاب لے کے آجاؤ۔ ہماری کوشش یہ ہوتی تھی کہ اُنہیں ٹال دیں۔ مگر یہ پتہ تھا کہ دوسرے دن پوری تفصیل سے پوچھیں کہ کس سوال کا کیا جواب لکھا تو بچنے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتے کہ اگر سارا دن پڑھائی کر رہی تھیں تو چند گھنٹے ٹی وی پر اپنا پسندیدہ پروگرام بھی دیکھ لو۔ بہت لوگوں کو اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ یہ کیسے ممکن ہے کیونکہ زیادہ تر لوگ امتحان کے زمانے میں اپنے گھر میں ٹی وی ہی نہیں کھولتے تھے کہ بچے پڑھیں گے نہیں۔

ہم سب بہن بھائی کھانے کی میز پر اپنا ہوم ورک کرتے تھے اور وہیں ٹی وی کھلا ہوتا تھا۔ اب مجھے یہ خیال آتا ہے کہ ہم لوگوں کی یہ ٹریننگ ہو رہی تھی کہ جو بھی کام کر رہے ہو اُس پر پوری توجہ رہے کہ کوئی آواز اور حرکت اُس میں خلل نہ ڈال سکے۔ وہ خود بھی اسی طرح لکھتے تھے۔ ہم سب بہن بھائی مل کے زور و شور سے باتیں کر رہے ہوتے مگر انھوں نے کبھی نہیں کہا کہ خاموش رہو۔ جب ہم لوگوں کو پتہ چل جاتا تھا کہ ابو یہاں بیٹھے لکھ رہے ہیں، تو اُن سے کبھی ایسے وعدے کروا لیتے تھے جو عام حالات میں نہ کرتے۔ وہ اتنی گہری سوچ میں ہوتے تھے کہ ایسا لگتا تھا کہ ہماری بات سُن رہے ہیں مگر دراصل وہ کچھ نہیں سن رہے ہوتے تھے۔

ابو کو ایک بات کا ہمیشہ خیال رہا وہ ہم بہنوں سے کہتے تھے کہ تعلیم سے زیادہ کوئی چیز اہم نہیں ہے۔ خاندان کے بزرگ، خاص طور پر ہماری دادی روایتی خیالات کی مالک تھیں۔ اکثر ابو سے ناراض ہوتی تھیں کہ لڑکیوں کو بس گھر داری آنا چاہئے۔

ابو دادی کی ہر بات مانتے تھے مگر لڑکیوں کا دفاع ہمیشہ کیا۔ بس مجھ سے یہ کہا کہ کھانا پکانا سیکھ لو تاکہ کسی کو اعتراض نہ ہو۔ میں نے کہا کہ میں پکا تو لوں گی مگر کوئی کھائے گا نہیں اس پر انھوں نے کہا کہ میں کھاؤں گا۔ شروع میں تو میں ہمیشہ نمک ڈالنا بھول جاتی تھی مگر اُنھوں نے کبھی نہیں کہا کہ نمک نہیں ہے۔ میں جب بھی پوچھا کہ آپ نے کیوں نہیں بتایا کہ نمک نہیں ہے تو انھوں نے یہی کہا کہ اور سارے مصالحے تو بالکل ٹھیک تھے نا۔ میں یونیورسٹی میں داخلے کی اجازت مانگی تو بہت خوش ہوئے اور فوراً اجازت دے دی۔ بس اس بات کا وعدہ کروا لیا کہ کبھی بس میں باہر لٹک کے نہیں جاؤ گی۔ اب یہ سب باتیں یاد آتی ہیں تو سوچتی ہوں کہ کاش وقت وہیں رک جاتا۔ پھر خیال آتا ہے یہ صرف میری ہی نہیں بلکہ اُن کے ہزاروں پرستاروں کی بھی یہی خواہش ہے کہ وہ اُن سے مل سکتے اُن سے بات کر سکتے۔ ابو نے کبھی اپنے پرستاروں کو مایوس نہیں کیا۔ اگر کسی

نے ملنے کی خواہش کی، ہمیشہ ان کو وقت دیا۔ ہم لوگ اپنے دوستوں کو لے کے آجاتے تھے۔ وہ آکر بیٹھتے تھے اور باتیں کرتے تھے وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ان ہی لوگوں کی وجہ سے میرا نام آگے بڑھ رہا ہے۔، اب میں دیکھتی ہوں مختلف جگہوں مختلف گروپس میں لوگ کس محبت سے اُن کا نام لیتے ہیں اور اُن کے لئے دُعا کرتے ہیں۔ اللہ تعالی وہ دُعائیں قبول کرے اور ہمارے ماں باپ کو اپنی رحمت کے سائے میں رکھے۔ آمین

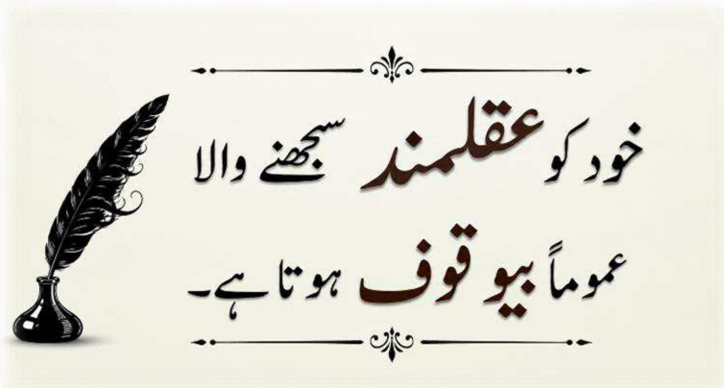

باب دوم

سخن در سخن

میں فارماسیوٹیکل کمپنی سے بزنس یونٹ ہیڈ کی حیثیت سے ریٹائر ہو کر بزنس پڑھایا۔ شاعری اور لکھنا کالج کے زمانے سے شروع کیا۔ باقاعدہ آغاز ۲۰۰۶ سے ہوا۔ نوائے وقت جسارت، پاسبان، مقدمہ،، جرائت جیسے روزناموں کے ساتھ ساتھ سہ مائی جریدوں مثلاً، پرواز لندن، ارتباط استنبول، مزاح پلس کراچی، شاعری کراچی لوح ادب کراچی، انشا کراچی حیدرآباد۔ سوہنی دھرتی حیدرآباد کے لیئے بھی لکھا۔ ان کے علاوہ مضامین، کالمز اور انشائیوں کے کئی مجموعہ شائع ہو چکے ہیں۔

1 . آپ کا ابن صفی سے پہلا تعارف کیسے ہوا؟ اس وقت پڑھنے میں اور آج ابن صفی کے مطالعہ میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے؟

جواب: پہلا تعارف " نیلے پرندے " سے ہوا اس کے بعد تما پچھلے ناول پڑھ ڈالے اور اب شاید ہی کوئی ناول ہو گا جو دس بار سے کم پڑھا ہو ابن صفی پر ہمے مضامین لکھ چکے ہیں جو کئی اخبارات میں شائع ہوئے ایک مضمون " ابن صفی کون "" میں بھی چھپا تھا۔ ایک مضمون کی کسی نے بھارت سے اپنی آواز میں آڈیو وڈیو بھی بنائی جو یوٹیوب پر موجود ہے

خوش ہوں کہ میں صاحب دستار نہیں ہوں
یہ بھی ہے بڑی بات کہ بے کار نہیں ہوں
بچپن سے ہی پڑھتے رہے ہیں ابن صفی کو
قاری ہوں ان کا، ان سا قلم کار نہیں ہوں
اک عمر گذاری ہے پڑھتے ہوئے جن کو
ناول نہیں ان کا۔ جسے دس بار نہ پڑھا ہو

.2 جاسوسی دنیا اور عمران سیریز میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب: دلچسپی میں دونوں یکساں ہیں۔ قانوں کی برتری دونوں میں ہے۔ سیکھنے کے مواقع بھی دونوں میں ہیں۔

.3۔ آپ کس بنیاد پر ابن صفی کو اردو جاسوسی ادب میں سب سے بڑا نام مانتے ہیں؟ کیا ابن صفی کو صرف جاسوسی ادب کا مصنف کہنا ان کی ادبی حیثیت کو محدود کرنا ہے؟

جواب: ابن صفی کے قارئین کی تعداد، اردو کے کسی بھی مصنف سے کئی گُنا زیادہ ہے۔ ابن صفی کو صرف جاسوسی ادب تک محدود کرنا کم علمی ہے۔ کوئی بھی مصنف، رومان، تاریخ، سماج، سیاست کو بنیاد بنا کر کسی بھی اہم موضوع پر رہنمائی کرتا ہے۔ ابن صفی نے سراغ رسانی کی آڑ میں کونسا موضوع زیر بحث نہیں لایا۔ سماجی، جمالیاتی، نفسیاتی،، تاریخی غرض ہر موضوع پر پر رہنمائی فرمائی۔

4۔ ابن صفی نے اپنے دور میں نوجوان نسل میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔۔ آج نوجوانوں میں یہ شوق پیدا کرنے اور ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کو نوجوانوں تک پہچانے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟؟

جواب: ابن صفی کے تمام ناول (ORIGINAL) یعنی فرسٹ ایڈیشن۔ مثلاً الہ باد یا کراچی سے شائع ہونے والے تمام ناولوں کو ہر ماہ ایک ایک کر کے شائع کیا جائے۔۔ بالکل اس ہی ٹائیٹل کے ساتھ۔۔۔ بس ایسا محسوس ہو یہ اس وقت کا ہی شائع شدہ ہے بس قیمت آج والی ہو ۹ آنے یا تیرہ آنے والی نہ ہو۔۔ باقی ہر چیز ایسی ہو جیسے یہ اس ہی وقت کا ہے۔

5۔ آپ کے خیال سے ابن صفی کے جاسوسی ناول قارئین کو حقیقت سے دور تخیلاتی دنیا میں لے جاتے ہیں یا حقیقت پسند بناتے ہیں؟ کیا ان میں کوئی سماجی اور اخلاقی پیغام بھی موجود ہے؟

جواب: کسی حد تک کہہ سکتے ہیں کہ تخیلاتی ہیں لیکن وقت نے ثابت کیا وہ تخیلاتی نہیں بلکہ مستقبل کی پیش گوئی تھی۔۔ مثلاً فولادی۔ دست قضا۔ جو کہ آج کے ڈرون کی صورت کام کرتا تھا۔ یا نقلی سورج جو چین نے اب بنایا۔۔ یا وبائی ہیجان جو آج کرونا کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس کے علاوہ سماجی اور اخلاقی ہی نہیں قانون سے محبت کا پیغام بھی ملتا ہے۔

6۔ اکثر اہلِ علم کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان ابن صفی کے ناول پڑھ کر سیکھی۔ آپ کے خیال میں ابن صفی کی تحریروں میں ایسی کون سی خصوصیات تھیں جو قاری کو زبان سکھا دیتی تھیں؟

جواب: ان کے قلم کی سادگی، برجستگی، دلچسپی۔ مزاح، قاری کو اردو سمجھنے اور سیکھنے میں معاون ہوئی۔۔ ہم نے خود ان سے ہی سیکھا۔ ایک سندھی ڈاکٹر نے بھی ہمیں بتایا تھا کہ اس نے اردو اس وجہ سے سیکھی۔ اس کی تفصیل ہمارے ایک مضمون میں مل سکتی ہے۔

7۔ ابن صفی کے ناولوں کی ایک اہم خوبی ان کی بہترین کردار نگاری مانی جاتی ہے ان کرداروں میں کون سی خاص بات تھی جو آج بھی قارئین کے ذہنوں میں تر و تازہ ہیں؟

جواب: ابن صفی کی منظر نگاری اور کردار نگاری پر ہمارا ایک مضمون ہے۔ ان کی کردار نگاری اتنی بھرپور ہوتی ہے کہ لگتا ہے یہ کردار ہمارے سامنے موجود ہے۔ اور وہ ذہن سے چپک جاتا ہے چاہے وہ مثبت ہو یا منفی ہو مثلاً تھریسیا، سنگ ہی، ڈریڈ ہو یا فنچ۔

8۔ آپ کی رائے میں ابن صفی کا بہترین مثبت کردار (عمران فریدی کے علاوہ) اور بہترین منفی کردار کون سا اور کیوں؟؟

جواب: کئی ہیں، صفدر، جولیا روشی جوزف۔ ثریا۔۔ قاسم، کیپٹن فیاض۔۔۔ منفی کرداروں میں تھریسیا، سنگ ہی، فنچ،

9۔ ابن صفی کے قارئین میں کئی نسلیں شامل ہیں۔ ان ناولوں میں ایسا کیا ہے جو انہیں آج کے ماحول پر منطبق کرتی ہے؟

جواب: ان کے ناول ہر دور کے لیئے یکساں ہیں ۔

10۔ کیا ابن صفی کو اردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا عوامی ادیب قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب: بالکل ان سے زیادہ کوئی نہیں۔۔ بڑے سے بڑے مصنف کی کتاب ۵ سے دس ہزار سے زیادہ نہیں جب کہ ان کی ہر کتاب کے لاکھوں قارئین ہیں۔۔ ان کی ہر کتاب کے کئی کئی ایڈیشن ہیں۔ اس کے علاوہ جب ایک آنہ لائیبریری کا سلسلہ تھا تو لائیبریری میں رکھی کسی بھی کتاب کے ۱۶ سے کم قاری تو ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ ایک کتاب اگر ۱۶ آنے کی تھی تو ظاہر ہے اگر قاری ۱۶ سے کم ہوں تو کتاب رکھنے کا کیا فائدہ۔ ہم شرطیہ کہہ سکتے ہیں ان کی ہر کتاب کے قاری لاکھوں میں ہیں۔ اب حساب لگا لیجئے تقریبا ۲۵۰ کتابیں ہر ایک کے کئی کئی ایڈیشن۔ ایک ایک کتاب کے کئی کئی قاری۔۔ اور ہم جیسے بھی جنہوں ہر ناول کو کم سے کم دس بار پڑھا ہے۔

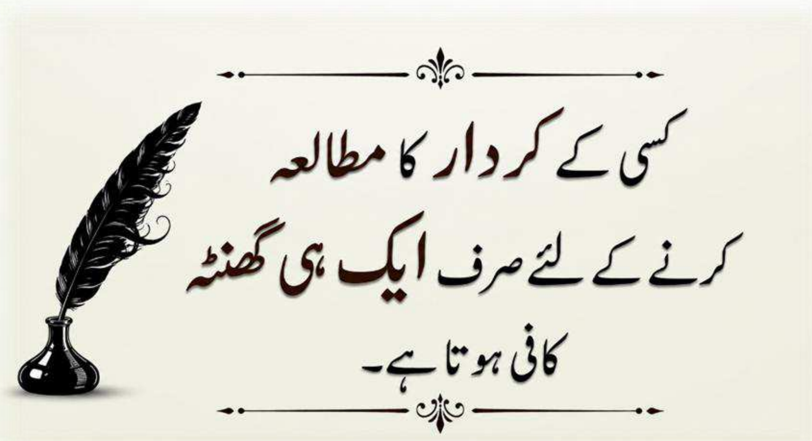

محمد حنیف
(حیدرآباد- سندھ)

محمد حنیف کا تعلق حیدرآباد پاکستان سے ہے اور کینیڈا میں مقیم ہیں۔ کمپیوٹر کی فیلڈ سے وابستہ ہیں۔ اردو ادب سے لگاؤ رہا ہے اور کم عمری سے ابن صفی کے مداح ہیں اور ابن صفی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ایک ویب سائٹ ابن صفی ڈاٹ انفو کے نام سے تخلیق کی ہے۔

1۔ آپ کا ابن صفی سے پہلا تعارف کیسے ہوا؟ اس وقت پڑھنے میں اور آج ابن صفی کے مطالعہ میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے ؟

جواب–بچپن سے ہی کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا۔ ۱۹۶۴ کا زمانہ تھا اور میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ بڑے بھائی کو کہانی کی کوئی کتاب پڑھتے ہوئے پایا۔ وہ ذرا ادھر ادھر ہوئے تو کتاب پر چپکے سے ایک نظر ڈالی۔ سرورق پر ایک خوبصورت سا چہرہ دیکھا اور ساتھ ہی ایک آدمی جو کہ سیڑھیوں سے الٹا گر رہا تھا۔ اوپر لکھا تھا۔ ابن صفی کی جاسوسی دنیا۔ صفحہ پلٹا تو اندر جلی الفاظ میں درج تھا۔ چاندنی کا دھوں۔ بھائی کے قدموں کی آہٹ پا کر کتاب کو واپس رکھ دیا۔ چند روز کے بعد کلاس میں ایک ساتھی کے پاس ایک کہانی کی کتاب نظر آئی۔ اس کا عنوان تھا" بلی چیختی ہے"۔ اس نے وہ کتاب مجھے ایک دن کے لئے پڑھنے کے لئے دے دی۔ اس تعلق کی بنا پر دوستی کی جو بنیاد پڑی وہ تعلق آج تک قائم ہے۔ پڑھا تو کچھ سمجھ آیا اور کچھ سر کے اوپر سے گذر گیا۔ اس کے بعد چچا کے گھر میں بھیانک آدمی اور جہنم کی رقاصہ پڑھنے کو ملے۔ تو یہ تھا ابن صفی سے ابتدائی تعارف۔

2۔ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب–جاسوسی دنیا ایک سنجیدہ پراسرار ناولوں پر مشتمل ہے جس میں کہانی جاسوسی کے مروجہ طریقوں کے ذریعے آگے بڑھتی ہے۔ ابن صفی نے عمران سیریز تخلیق کر کے ان مروجہ طریقوں سے ہٹ کر ایک نئی راہ نکالی جس کی بے حد پذیرائی کی گئی۔

3۔ آپ کس بنیاد پر ابن صفی کو اردو جاسوسی ادب میں سب سے بڑا نام مانتے ہیں؟ کیا ابن صفی کو صرف جاسوسی ادب کا مصنف کہنا ان کی ادبی حیثیت کو محدود کرنا ہے؟

جواب–اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن صفی کا نام اردو جاسوسی ادب میں سر فہرست ہے اور ان کے بعد اس صنف میں کوئی طبعزاد لکھنے والا اس درجہ پر نہیں پہنچ سکا۔ ابن صفی نے لکھنے کا آغاز طنزیہ ادبی مضامین سے کیا تھا اور ساتھ ہی اعلیٰ درجے کے شاعری بھی شامل تخلیق رہی۔ اسی بنا پر انہوں نے جاسوسی کہانیوں میں بھی اردو کا ایک ایسا بلند معیار قائم رکھا جس کی بدولت انہیں اردو ادب میں بھی ایک انفرادی حیثیت حاصل ہے۔

4۔ابن صفی نے اپنے دور میں نوجوان نسل میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔۔ آج نوجوانوں میں یہ شوق پیدا کرنے اور ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کو نوجوانوں تک پہچانے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے ؟؟

جواب– آج کی نسل کتابوں کو ڈیجیٹل شکل میں پڑھنا زیادہ پسند کرتی ہے۔اسی بنا پر اب ابن صفی کے ناولوں کو اس نئی شکل میں قارئین تک پہنچایا جارہا ہے تا کہ وہ ان دلچسپ تحریروں کو اپنی پسند کے میڈیا میں پڑھ سکیں۔

5- آپ کے خیال سے ابن صفی کے جاسوسی ناول قارئین کو حقیقت سے دور تخیلاتی دنیا میں لے جاتے ہیں یا حقیقت پسند بناتے ہیں؟ کیا ان میں کوئی سماجی اور اخلاقی پیغام بھی موجود ہے؟

جواب– پاک وہند میں ایسی کئی معروف شخصیات گذری ہیں جو ابن صفی کے مستقل قاری تھے۔ابن صفی کی تحریریں حقیقی دنیا سے قریب تر تھیں کیونکہ وہ حالات وواقعات کو پیش نظر رکھ کر ناول تخلیق کیا کرتے تھے۔انہوں نے اپنی تحریروں میں سماج کی خامیوں کی تشخیص کی اور ساتھ ہی ان کا علاج بھی تحریر فرمایا۔انہوں نے قانون کا اُحترام کرنے کا پیغام دیا۔فریدی، حمید اور عمران قانون کی بالادستی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کے کردار قاری کو ایک مضبوط شخصیت بنانے کی ترغیب دیتے ہیں۔

6۔اکثر اہل علم کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان ابن صفی کے ناول پڑھ کر سیکھی۔ آپ کے خیال میں ابن صفی کی تحریروں میں ایسی کون سی خصوصیات تھیں جو قاری کو زبان سکھا دیتی تھیں؟

جواب–ابن صفی کی تحریروں اس قدر دلچسپ ہوتی تھیں کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ قارئین کے ساتھ وہ کم پڑھے لکھے افراد میں یکساں مقبول تھے۔جو پڑھنا نہیں جانتے تھے وہ دوسروں سے سن کر لطف اندوز ہوتے تھے اور پھر وہ کوشش کر کے خود پڑھنا سیکھ لیتے تھے۔

7۔ابن صفی کے ناولوں کی ایک اہم خوبی ان کی بہترین کردار نگاری مانی جاتی ہے ان کرداروں میں کون سی خاص بات تھی جو آج بھی قارئین کے ذہنوں میں تروتازہ ہیں؟

جواب–ابن صفی نے مرکزی کرداروں کے علاوہ ایسے متعدد کردار تخلیق کئے جو ذہنوں سے چپک کر رہ جاتے تھے۔یہ کردار زندگی سے قریب تر تھے۔اور کہانی کے تانے بانے کے ساتھ ان کی شخصیت کو اس مہارت سے آگے بڑھایا جاتا تھا کہ وہ ہمارے اردگرد چلتے پھرتے محسوس ہوتے تھے۔

8۔ آپ کی رائے میں ابن صفی کا بہترین مثبت کردار (عمران فریدی کے علاوہ) اور بہترین منفی کردار کون سا اور کیوں؟؟

جواب۔ابن صفی نے متعدد مثبت اور منفی کردار تخلیق کئے اور یہ ان کے بیان کی قوت تھی کہ کسی ایک کردار کو دوسرے کردار پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔

9۔ابن صفی کے قارئین میں کئی نسلیں شامل ہیں۔ان ناولوں میں ایسا کیا ہے جو انہیں آج کے ماحول پر منطبق کرتی ہے؟

جواب۔ابن صفی نے بارہا اپنی تحریروں میں حالات وواقعات کے ذریعے مستقبل میں آنے والی تبدیلیوں کا ایک اشارہ دیا۔ان میں سائنسی ایجادات کے ساتھ بین الاقوامی سیاسی منظر نامہ کا تذکرہ بھی شامل ہے۔اسی بنا پر ان کی تحریریں آج کے ماحول میں بھی اپنی دلچسپی برقرار رکھتی ہیں۔

10۔ کیا ابن صفی کو اردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا عوامی ادیب قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب–اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان میں جتنے قارئین ابن صفی کے حصے میں آئے، اس کا مقابلہ کسی اور مصنف سے نہیں کیا جا سکتا۔

تبسم حجازی کا تعلق ممبئی سے

ہے اور امریکہ میں قیام پذیر ہیں۔ انجنیر نگ کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔ مضامین، تبصرہ، سفر نامے لکھتی ہیں۔۔ ابن صفی پر ان کی ایک تحقیقی کتاب شائع ہو چکی ہے۔

1. آپ کا ابن صفی سے تعارف کیسے ہوا اور عمر کے کس دور میں ہوا؟؟ اس وقت پڑھنے میں اور اب ابن صفی کو پڑھنے میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے؟

جواب - ابن صفی سے تعارف تو آنکھ کھولتے ہی ہو گیا تھا۔ گھر میں مجھ سے پہلے کی دو نسلیں ابن صفی کو پڑھتی تھیں تو کتابیں آس پاس ہی ہوتی تھیں۔ دس سال کی عمر میں پہلی بار ابن صفی کو پڑھا اور ایک نئی دنیا سے متعارف ہوئی۔ اس دور میں عمران کی اوٹ پٹانگ حرکتیں زیادہ پسند آتیں تھیں یا پھر جاسوسی دنیا کے پلاٹ اور سسپنس پر توجہ ہوتی۔ پھر کالج کے دور میں پڑھا تو فریدی اور عمران کے کرداروں کی خوبیاں سمجھ میں آنے لگیں۔ بین الاقوامی سازشیں، سائنسی ایجادات اور دنیا بھر کے ممالک کی سیر کا لطف آنے لگا لیکن ابن صفی سے ابھی بھی مکمل تعارف نہیں ہوا تھا۔ عمر کے درمیانے دور میں جب مکمل سیریز ترتیب سے پڑھی تو محسوس ہوا کہ یہ عام ناول نہیں ہیں بلکہ ان میں سماجی، سیاسی، نفسیاتی ہر موضوع پر اتنا کچھ موجود ہے کہ ان پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

2. ابن صفی کی دونوں سیریز جاسوسی دنیا اور عمران میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب - عموماً لوگ ان دونوں سیریز کے فرق کو ان کے مرکزی کرداروں سے ناپتے ہیں۔ لیکن میری دانست میں فرق مختلف سطحوں پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

دونوں سیریز کا سیٹ اپ اور محل وقوع، ان کی تکنیک، ان میں موجود کہانیوں کی نوعیت اور دونوں میں مزاح کا انداز سب ہی الگ ہے۔

جاسوسی دنیا کا ماحول قبل از تقسیم کا ماحول محسوس ہوتا ہے تو عمران سیریز کا بعد از تقسیم لگتا ہے۔ جاسوسی دنیا کی کہانیاں whodunnit قسم کی ہوتی ہیں۔ تو عمران سیریز کی اسپائی تھرلر۔۔ جاسوسی دنیا میں حمید راوی ہے جبکہ عمران سیریز میں قاری کہانی کے ہر رخ کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ جاسوسی دنیا کا ماحول سنجیدہ ہے اس لئے حمید اور قاسم کی احمقانہ حرکتوں سے مزاح پیدا کیا گیا۔ عمران سیریز میں عمران کے کردار سے بظاہر پُر مزاح لیکن اکثر چبھتے جملوں سے مزاح تخلیق ہوا۔ جاسوسی دنیا کے ہر ناول میں ایک نیا مجرم ہوتا ہے جو اکثر ذاتی وجوہات کی بنا پر جرم کرتا ہے جیسے نارنگ، جابر، حکیم جالینوس۔۔ عمران سیریز میں اکثر مجرم تنظیمیں ہیں۔

غرضیکہ کہ ابن صفی نے دو الگ دنیائیں تخلیق کیں اور انہیں برسوں تک اپنی الگ شناخت کے ساتھ زندہ رکھا۔۔

3۔ آپ کس بنیاد پر ابن صفی کو اردو جاسوسی ادب میں سب سے بڑا نام مانتے ہیں؟ کیا ابن صفی کو صرف جاسوسی ادب کا مصنف کہنا ان کی ادبی حیثیت کو محدود کرنا ہے؟

جواب– ابن صفی کو جاسوسی ادب کا سب سے بڑا نام ماننے کی وجہ یہ ہے وہ سری ادب کا پہلا نام تو ہیں ہی لیکن آخری بھی ہیں۔انھوں نے اردو میں سری ادب کی بنیاد رکھی اور پھر اسے نکھارا سنوارا اور عروج تک پہنچایا۔اس طرح کہ اس کے بعد مزید بہتری کی گنجائش نہیں رہی۔ان کے بعد جاسوسی ادب میں آنے والے تمام مصنفین نے ان ہی کے بنائے فریم ورک پر کام کیا۔۔ادب میں یا کسی بھی فن میں یہ بہت ہی کم ہوتا ہے کہ کسی نئی جہت کی ابتدا کرنے والا ہی اسے عروج تک پہنچائے۔ اردو فکشن کی ابتدا ملا وجہی یا ڈپٹی نذیر نے کی لیکن اسے عروج تک ان کے بعد آنے والے مصنفین نے پہنچایا۔یہی چیز شاعری فلم اور ہر شعبے میں رائج رہی سوائے اردو جاسوسی ادب کے جہاں ایک ہی شخص بانی بھی تھا اور وہی اس شعبہ کا سب سے بہترین مصنف بھی۔

ابن صفی نے جاسوسی ادب میں جو کر دیا وہ ہی ان کی شناخت کو پائندہ رکھنے کے لئے کافی ہے لیکن ابن صفی نے طنزومزاح اور شاعری میں اپنا کمال دکھایا ہے اور چونکہ جاسوسی ناولوں کی مقبولیت کے باعث وہ ان دوجہتوں کو وقت کم دے پائے اس وجہ سے ان کی تخلیقات محدود ہیں لیکن جو ہیں انھیں دیکھ کر یہ کہنا مشکل نہیں کہ ابن صفی صرف جاسوسی ادب کے مصنف نہ ہو کر ایک اعلی طنزومزاح نگار اور عمدہ شاعر بھی تھے۔

4. ابن صفی نے اپنے دور میں نوجوان نسل میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے اہم کردار ادا کیا۔۔اج نوجوانوں میں یہ شوق پیدا کرنے اور ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کو نوجوانوں تک پہچانے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟

جواب–یقیناابن صفی کی ناولوں نے ایک نہیں تین نسلوں میں مطالعہ کے شوق کو بڑھاوادیا۔ان کے پڑھنے والوں میں ہر عمر اور صنف کے لوگ رہے ہیں اور آج کی نسل بھی انھیں پڑھ رہی ہے لیکن مجموعی طور پر نئی نسل میں خاص طور بر صغیر میں پڑھنے کا رجحان کم ہو رہا ہے۔اس کی ایک وجہ تو تفریح کے نئے ذرائع دوسری وجہ ارتکاز کی کمی۔۔آج کی نسل فلم سے ٹی وی، یوٹیوب اور اب ریلز اور ٹک ٹاک پر آ گئی ہے۔ان میں کتاب پڑھنے کا رجحان واپس لانا ایک مشکل کام ہے ۔اسے ابتدائی سطح سے شروع کرنا ہو گا ۔مغربی ممالک کے برخلاف ہمارے نصاب میں تفریحی ادب بالکل شامل نہیں ہے۔ابن صفی اور ان جیسے دیگر مصنفین کی کتابیں اسکول کے نصاب میں شامل ہونی چاہیں تا کہ بچوں میں پڑھنے سے دلچسپی پیدا ہو ۔

اس کے علاوہ نوجوانوں کے لیے ان ناولوں پر ویب سیریز وغیرہ بنی چاہئے۔شرلاک ہومز اور ہرکیو پائیرو سے لے کر ڈاونچی تک فکشن کے بے حساب کردار آج فلموں اور سیریز کی بدولت مقبول ہیں تو فریدی اور عمران کیوں نہیں۔

5. آپ کے خیال سے ابن صفی کے جاسوسی ناول قارئین کو حقیقت سے دور تخیلاتی دنیا میں لے جاتے ہیں یا حقیقت پسند بناتے ہیں؟ کیا ان میں کوئی سماجی اور اخلاقی پیغام بھی موجود تھا؟

جواب۔یہ پڑھنے والے کی فہم اور سمجھ پر منحصر ہے۔جب کم عمری میں ابن صفی کو پڑھا جاتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کسی طلسمی دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔جہاں فے گزار ہیں، فولادی ہے زبیر امین ہے، بولتے پرندے اور فلسفہ سمجھاتے بندر ہیں۔۔کبھی ہوں لگتا ہے عمران اور فریدی ہمارے سپر ہیرو ہیں جو برائی کا خاتمہ کرنے نکلے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے ان ناولوں کو گہرائی سے سمجھنا شروع کرتے ہیں ان میں چھپے طنز سمجھ میں آتے ہیں۔یہ پتہ چلتا ہے کہ ابن صفی نے کس طرح اپنے دور کے مسائل اور برائیوں کی نشان دہی کی اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات بیان کئے اور ساتھ ہی بتایا کہ ان حالات میں ہمارا کردار کیا ہونا چاہیے۔یہ ان کے ناولوں کی ایک بہت بڑی خوبی تھی کہ وہ تفریح کے ساتھ اس طرح نصیحت کر جاتے کہ قاری کو بوریت بھی نہ ہو اور بات ذہن پر رقم بھی ہو جائے۔

6. اکثر اہلِ علم کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان ابن صفی کے ناول پڑھ کر سیکھی۔ آپ کے خیال میں ابن صفی کی تحریروں میں ایسی کون سی خصوصیات تھیں جو قاری کو زبان سکھا دیتی تھیں؟

جواب۔ بہت سے لوگوں نے نہ صرف اردو پڑھنی بلکہ لکھنا بھی ابن صفی سے سیکھا جن میں راقم الحروف بھی شامل ہے۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی شستہ زبان، اس میں موجود شگفتگی اور روانی تھی جو پڑھنے والے کو جکڑ لیتی۔۔ اور ساتھ ہی ان کی تحریر جتنی سلیس اور رواں لگتی کہ قاری سوچتا ہے کہ میں بھی کوشش کر سکتا ہوں۔ اگر شاعری کی اصطلاح میں کہنا ہو تو یہ سہل ممتنع کہی جاسکتی ہیں۔

7. ابن صفی کے ناولوں کی ایک اہم خوبی ان کی بہترین کردار نگاری مانی جاتی ہے ان کرداروں میں کون سی خاص بات تھی جو آج بھی قارئین کے ذہنوں میں زندہ کیوں ہیں؟

جواب: کسی بھی مصنف کی تخلیق سے زیادہ جو چیز لوگوں کے ذہن میں رہ جاتی ہے وہ ان کے تخلیق کردہ کردار ہیں۔ اس معاملہ میں ابن صفی کا کمال ہے کہ ان کے دو مرکزی کردار مقبول ہوئے اور آج بھی ذہنوں پر نقش ہیں۔ ساتھ ہی ان کے تخلیق کردہ ولن اور چھوٹے اور ثانوی کردار بھی لوگوں کو یاد رہتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ کہ ان کے کردار حقیقت سے قریب ہوتے ہیں۔ ان کے کرداروں میں اچھائیاں اور برائیاں دونوں نظر آتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے منفی کرداروں سے بھی انسان ہمدردی محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے اس دور کا قاری ہو یا آج کا قاری ہو وہ ان کرداروں سے مکمل نہ سہی، ان کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو سی انسان خود کو ہم آہنگ محسوس کرتا ہے۔ ان جیسا بننے کی اور ان کی نقل کی کوشش کرتا ہے۔ کرداروں کی یہی خوبی انہیں دوام بخشتی ہے۔

8. آپ کی رائے میں ابن صفی کا بہترین مثبت کردار (عمران فریدی کے علاوہ) اور بہترین منفی کردار کون سا ہے اور کیوں؟

جواب۔ اگر شخصیت کے پہلو سے دیکھیں تو عمران سیریز میں روشی، صفدر اور جوزف کے کردار جاسوسی دنیا میں نیلم اور نادر کا کردار پسند ہے۔۔ روشی اور نیلم دونوں برائی کے راستہ چھوڑ کر ہمت سے سچ کے راستہ پر آتی ہیں۔ جوزف اور صفدر اپنی وفاداری کے باعث پسند ہیں۔۔ منفی کرداروں میں ڈیڈلی فراگ اور ایڈلاوا کے کردار پسند ہیں دونوں ہی بہت بڑی سطح کے مجرم لیکن کسی حد تک وضع دار بھی ہیں۔

ان کے علاوہ کردار کے ارتقا کی مناسبت سے جیمسن اور حمید کے کردار پسند ہیں۔ حمید کا کردار کھلنڈرے نوجوان سے ایک عمدہ سراغ رساں تک بہت عمدگی سے آگے بڑھتا ہے۔ یہی چیز جیمسن کے کردار میں نظر آتی ایک چھوٹے سے ثانوی کردار سے عمران کی ٹیم کا اہم حصہ بننے تک یہ کردار کافی دلچسپ نظر آتا ہے۔۔

9. ابن صفی کے قارئین میں کئی نسلیں شامل ہیں۔ ان ناولوں میں کیا چیز ہے جو انھیں آج کے ماحول پر منطبق کرتی ہے؟

جواب۔ 1951 سے اب تک چار نسلیں گذر چکی ہیں جنہوں نے ابن صفی کو پڑھا اور لطف اندوز ہوئے۔

کسی بھی تحریر کے زندہ رہنے کے لئے اہم ہے کہ مصنف نا صرف اپنے دور کی درست عکاسی کرے بلکہ وہ دور بین بھی ہو اور آنے والے وقت کی جھلک بھی دکھائے۔۔

ابن صفی کے ناولوں میں یہ چیز ہمیشہ موجود رہی۔ وہ ایک طرف تو ساٹھ ستر کے معاشرتی اور سیاسی مسائل جیسے ڈرگز، ہپی ازم، کولڈ وار کا ذکر کرتے ہیں، وہیں سیٹلائٹ وار، گلوبل وارمنگ، آنے والے دور کی سیاسی رسہ کشی کے ساتھ ساتھ جدید ٹیکنالوجی اور ان کے اثرات کی باتیں بھی کرتے ہیں۔ ان کی ناولوں میں جن ایجادات کا ذکر بطور فکشن ہوتا تھا وہ آج کے دور کی حقیقت بن چکی ہیں۔ اس لئے آج بھی ان کے ناول پرانے یا آج کے ماحول سے غیر متعلق محسوس نہیں ہوتے۔

10۔ کیاابن صفی کواردوزبان کاسب سے زیادہ پڑھاجانے والاعوامی ادیب قرار دیاجاسکتاہے؟

جواب: بلکل ماناچاہیے۔۔۔ابن صفی جیسامقبول اورپڑھاجانے والارائٹراردوادب میں شاید ہی کوئی ہو۔۔1950 سے اب تک اردو کے کتنے ایسے مصنف ہوں گے جن کی کتابوں کے ایڈیشن برسوں بعد چھپنے پر بھی ہاتھوں ہاتھ بکتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں بکتے ہیں یا جن کے کرداروں پر کئی سولوگوں نے طبع آزمائی کی اور جس کی تحریروں پر سیکڑوں کتابیں لکھی جاچکی ہوں۔

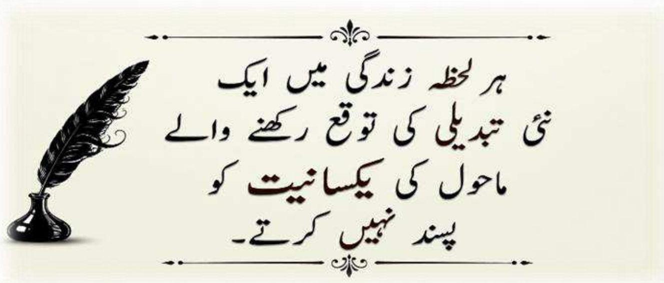

انور ظہیر رہبر کا تعلق پاکستان سے ہے اور جرمنی میں رہائش ہے۔ فزکس میں ماسٹرز کی تعلیم کے بعد اردو کی مختلف اصناف سے منسلک رہے ہیں۔ شاعر، افسانہ نگار، کالم و مضامین نگار ہیں۔ ان کے کئی شعری اور نثری مجموعے انڈیا پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں ۔ انہیں کئی اعزازت سے نوازا جا چکا ہے

1. آپ کا ابن صفی سے تعارف کیسے ہوا اور عمر کے کس دور میں ہوا؟؟ اس وقت پڑھنے میں اور اب ابن صفی کو پڑھنے میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے؟

جواب–دسویں جماعت کے امتحانوں سے فارغ ہو کر نتیجے کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک دن دیکھا کہ میرے بڑے بھائی کے ہاتھوں میں کوئی ابن صفی کی عمران سیریز جگمگا رہی ہے۔ پڑھنے کی عادت ابا محروم نے گھر میں " نونہال "رسالہ اور" بچوں کی دنیا "کے ساتھ پکی تو کرواہی دی تھی سو جھٹ بھیا سے اس کتاب کو بھی پڑھنے کی خواہش ظاہر کر دی۔ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد بھائی صاحب نے ابن صفی کا ایک ناول جو عمران سیریز کی تھی مجھے تھما دیا۔ پھر کیا تھا ہم نے بھائی جان کے ساتھ مل کر محلے کی پرانی لائبریری سے عمران سیریز اور پھر بعد میں جاسوسی سیریز کیپٹن فریدی پڑھ ڈالی۔ بعد میں تو یہ ہونے لگا کہ عمران سریز کا انتظار کرنے لگے اور لائبریری کے مالک کو کہہ رکھا تھا کہ عمران سیریز پرانی نہیں ہونی چاہیے پہلے ہم دونوں بھائی پڑھ لیں پھر کسی اور کو آگے دیں۔ یہ ایک نشہ تھا ابنِ صفی کو پڑھنے کا نشہ، میں سمجھتا ہوں جس نے بھی ابنِ صفی کو پڑھا ہے وہ بھی ضرور اس نشے میں مبتلا ہوا ہو گا۔

رہی بات مطالعے میں فرق تو اس سلسلے میں یہ بات نہایت اہم ہے کہ ابن صفی کے زمانے میں قارئین نسبتاً طویل وقت ایک ہی کتاب کے ساتھ گزارتے تھے اور لمبی تفصیلات اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے والی کہانیاں زیادہ قبول کی جاتی تھیں۔ لیکن آج کے دور میں مختصر اور تیز رفتار مواد کی طرف رجحان بڑھ گیا ہے۔ بہت سے قارئین جلدی نتیجہ اور مسلسل سنسنی خیزی چاہتے ہیں۔ اسی طرح دیکھا جائے تو پہلے کتاب، رسالے ملنے کا ایک ہی ذریعہ تھا جس میں لائبریری نمایاں تھی، لوگ نئی قسط یا نیا ناول آنے کا انتظار کرتے تھے اور کتاب حاصل کرنا خود ایک سرگرمی ہوتی تھی۔ جب کہ آج کل ای بک، موبائل فون، ویب سائٹس اور سوشل میڈیا موجود ہیں اور ہزاروں کتابیں چند سیکنڈ میں دستیاب ہو سکتی ہیں اور ایک کتاب کو توجہ حاصل کرنے کے لیے ویڈیوز، گیمز اور دیگر ڈیجیٹل مواد سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

2. ابن صفی کی دونوں سیریز جاسوسی دنیا اور عمران میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب–جاسوسی دنیا اور عمران سیریز بظاہر دونوں جاسوسی ادب ہیں، لیکن ان کا مزاج، ماحول اور مرکزی کردار ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہیں۔ بہت سے ناقدین کے نزدیک عمران سیریز ابنِ صفی کی فنی پختگی کا اگلا مرحلہ ہے۔ اس میں ان کی زبان زیادہ نکھری ہوئی، طنز زیادہ گہرا اور کردار زیادہ پیچیدہ نظر آتے ہیں۔ جبکہ جاسوسی دنیا میں ان

کے تخلیقی جوش اور معمہ سازی کی ابتدائی قوت زیادہ نمایاں ہے۔ اگر میں اپنی ذاتی پسند کی بات کروں تو میں سمجھتا ہوں کہ جاسوسی دنیا ایک معمہ اور سنجیدہ ادب ہے، جبکہ عمران سیریز کردار نگاری، مزاح اور اسے دوبارہ پڑھنے کے لطف کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ ابنِ صفی کے مداحوں میں یہ بحث آج بھی جاری ہے کہ فریدی زیادہ یادگار ہے یا عمران۔۔

۔ آپ کس بنیاد پر ابن صفی کو اردو جاسوسی ادب میں سب سے بڑا نام مانتے ہیں؟ کیا ابن صفی کو صرف جاسوسی ادب کا مصنف کہنا ان کی ادبی حیثیت کو محدود کرنا ہے؟

جواب-یہ ایک اہم ادبی سوال ہے۔ میرے خیال میں ابنِ صفی کو اردو جاسوسی ادب کا سب سے بڑا نام ماننے کے لیے صرف ان کی مقبولیت ہی کافی نہیں ہے بلکہ کئی ادبی اور تاریخی عوامل بھی موجود ہیں اور جن پر اگر بات کروں گا تو جواب کافی طویل ہو جائے گا اس لیے مختصر یہی کہوں گا کہ اردو میں جاسوسی ادب ابنِ صفی سے پہلے بھی موجود تھا، لیکن ابن صفی نے اسے ایک مستقل ادبی صنف کی حیثیت دی ہے اور آنے والے بیشتر مصنفین بھی اسی اثر کے تحت نظر آتے ہیں۔ ابنِ صفی کی نثر سادہ ہونے کے باوجود بے حد منفرد ہے۔ مزاح، طنز، مکالمہ نگاری اور منظر کشی کا ایسا امتزاج اردو میں کم ملتا ہے۔ ان کے جملوں کی ایک خاص آواز ہے جسے قاری چند سطروں میں پہچان لیتا ہے اور جب کئی نسلوں تک لاکھوں قارئین ایک ہی مصنف کو پڑھتے رہیں تو پھر وقت اسے ایک ان مٹ مصنف کا درجہ دے دیتا ہے۔ رہا سوال کہ کیا انہیں صرف جاسوسی ادیب کہنا ان کی حیثیت کو محدود کرنا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ابنِ صفی کو صرف جاسوسی ناول نگار کہنا ان کے فن کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ زیادہ درست بات یہ ہوگی جب ہم انہیں جاسوسی ادب کا ایک ہمہ جہت فکشن نگار کہیں گے، جنہوں نے تفریح، مزاح، کردار نگاری اور تخیل کو اس طرح یکجا کیا کہ ان کا اثر صنفِ جاسوسی سے کہیں آگے تک پھیل گیا ہے۔

4. ابن صفی نے اپنے دور میں نوجوان نسل میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے اہم کردار ادا کیا۔۔ اج نوجوانوں میں یہ شوق پیدا کرنے اور ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کو نوجوانوں تک پہچانے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟

جواب-یہ سوال صرف ابنِ صفی کے بارے میں نہیں ہے بلکہ آج کے مطالعے کے بحران کے بارے میں بھی ہے۔

میرا خیال ہے کہ آج کے نوجوانوں تک ابنِ صفی کو پہنچانے کے لیے سب سے بڑی غلطی یہ ہوگی کہ انہیں محض " ایک عظیم کلاسیکی مصنف " کے طور پر پیش کیا جائے۔

نوجوان اکثر نصیحت سے نہیں، تجربے اور دلچسپی سے جڑتے ہیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ آج ابنِ صفی کو زندہ رکھنے کا بہترین طریقہ یہ نہیں ہے کہ نوجوانوں سے کہا جائے کہ وہ ابنِ صفی کی کتابیں پڑھیں، بلکہ یہ ہے کہ انہیں پہلے عمران، فریدی اور حمید سے ملوایا جائے۔ جب کردار دل میں جگہ بنا لیں گے تو کتاب خود راستہ بنا لے گی، میرے خیال میں آج کا نوجوان مطالعے سے نفرت نہیں کرتا۔ وہ صرف ایسے مواد کا عادی ہو چکا ہے جو فوراً اس کی توجہ حاصل کر لے۔ ابنِ صفی کی خوش قسمتی یہ ہے کہ ان کے پاس کردار، مزاح، معمہ اور رفتار، چاروں چیزیں موجود ہیں۔ اس لیے یہ باتیں نوجوانوں کو جلد اپنی طرف توجہ دلانے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

. آپ کے خیال سے ابن صفی کے جاسوسی ناول قارئین کو حقیقت سے دور تخیلاتی دنیا میں لے جاتے ہیں یا حقیقت پسند بناتے ہیں؟ کیا ان میں کوئی سماجی اور اخلاقی پیغام بھی موجود تھا؟

جواب-یہ سوال ابنِ صفی کی ادبی حیثیت کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہے، کیونکہ اس کا جواب " یا تو تخیلاتی دنیا، یا حقیقت پسندی " میں نہیں آتا۔ ابنِ صفی کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ اس لیے میں کہوں گا کہ ابنِ صفی نہ صرف قاری کو تخیل کی دنیا میں لے جاتے ہیں بلکہ اسے حقیقت کو زیادہ باریک بینی سے

دیکھنے کی تربیت بھی دیتے ہیں۔ ان کے ہاں تفریح، تخیل، عقل اور اخلاق چاروں عناصر ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ ایک ہی ادبی تجربے کا حصہ ہیں۔ اب سوال کے دوسرے حصے کی بات تو یہ کہوں گا کہ ابنِ صفی براہِ راست وعظ کرنے والے مصنف نہیں تھے، لیکن ان کے ناولوں میں سماجی تبصرہ مسلسل موجود رہتا ہے۔

6. اکثر اہلِ علم کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان ابن صفی کے ناول پڑھ کر سیکھی۔ آپ کے خیال میں ابن صفی کی تحریروں میں ایسی کون سی خصوصیات تھیں جو قاری کو زبان سکھا دیتی تھیں؟

جواب۔ یہ بات واقعی دلچسپ ہے کہ برصغیر کے بے شمار قارئین کہتے ہیں کہ ہم نے اردو ابنِ صفی سے سیکھی ہے۔ یہ دعویٰ کسی اور اردو ناول نگار کے بارے میں اتنی کثرت سے نہیں سنائی دیتا ہے۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ لوگوں نے صرف اردو کے الفاظ ابنِ صفی سے نہیں سیکھے، بلکہ اردو کا مزاج سیکھا ہے۔ ان کی نثر میں شائستگی بھی ہے، شوخی بھی، مزاح بھی، روانی بھی اور ادبی وقار بھی۔ شاید یہی امتزاج انہیں زبان سکھانے والا مصنف بنا دیتا ہے، حالانکہ ان کا مقصد کبھی زبان سکھانا نہیں تھا۔

7. ابن صفی کے ناولوں کی ایک اہم خوبی ان کی بہترین کردار نگاری مانی جاتی ہے ان کرداروں میں کون سی خاص بات تھی جو آج بھی قارئین کے ذہنوں میں زندہ کیوں ہیں؟

جواب۔ ابنِ صفی کی کردار نگاری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے کردار صرف کہانی کا حصہ نہیں ہوتے ہیں، بلکہ اپنی مستقل شخصیت رکھتے ہیں۔ ان کا کوئی بھی کردار اُٹھا کر دیکھ لیں آپ کو لگے گا ہمارے آس پاس کہیں وہی کردار رہتا ہے۔

8. آپ کی رائے میں ابن صفی کا بہترین مثبت کردار (عمران فریدی کے علاوہ) اور بہترین منفی کردار کون سا ہے اور کیوں؟

عمران اور فریدی کے علاوہ ابنِ صفی کے کئی کردار ایسے ہیں جو قارئین کے ذہن میں مستقل جگہ بنا لیتے ہیں۔ مثبت کرداروں میں کیپٹن حمید، جوزف، جولیا اور سلیمان۔ جبکہ منفی کرداروں میں سنگ ہی، جیرالڈ شاستری وغیرہ ہی ذہن میں یاد رہ گئے ہیں۔

9. ابن صفی کے قارئین میں کئی نسلیں شامل ہیں۔ ان ناولوں میں کیا چیز ہے جو انھیں آج کے ماحول پر منطبق کرتی ہے؟

جواب۔ یہی شاید ابنِ صفی کی سب سے بڑی کامیابی ہے کہ ان کے ناول اپنے دور کی پیداوار ہونے کے باوجود صرف اپنے دور تک محدود نہیں رہے۔ ابنِ صفی آج بھی اس لیے پڑھے جاتے ہیں کہ ان کے ناول صرف معمہ حل کرنے کے بارے میں نہیں ہیں، وہ انسانی ذہن، عقل، مزاح اور کردار کے بارے میں ہیں۔ اور جب تک یہ چیزیں موجود ہیں، ابنِ صفی کی دنیا بھی زندہ رہے گی۔

س10۔ کیا ابن صفی کو اردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا عوامی ادیب قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہاں ابنِ صفی کو بڑے اعتماد کے ساتھ اردو کا سب سے زیادہ پڑھے جانے والا عوامی ادیب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن "سب سے زیادہ "کہنا اس بات پر منحصر ہے کہ آپ پیمانہ کیا رکھتے ہیں۔ لیکن پیمانہ کوئی سا بھی ہو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس میں کسی طرح کا کوئی شک نہیں ہے کہ ابنِ صفی ایک عوامی ادیب تھے اور ہیں اور یہی ان کی اصل پہچان بھی ہے۔ وہ ایسے ادیب ہیں جنہوں نے ادب کو صرف لائبریریوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے عام قاری کے روزمرہ ذوق کا ایک مکمل حصہ بنا دیا۔

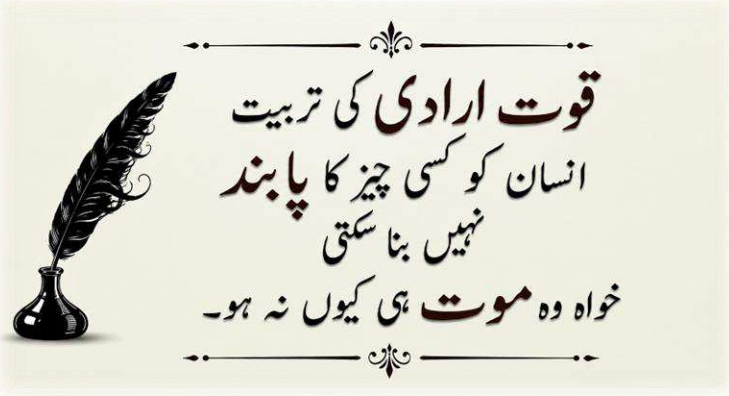

سیدہ شگفتہ شاہ کا تعلق حیدر آباد سندھ سے ہے۔ سندھی ادب میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کرنے تدریس کے شعبہ سے منسلک ہو گئیں۔ مصوری، کمپیرنگ اسکرپٹ رائٹنگ، صحافت کے علاوہ ان کی سندھی اور اردو میں سات کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور تین زیر طبع ہیں۔

1۔ آپ کا ابن صفی سے پہلا تعارف کیسے ہوا؟ اس وقت پڑھنے میں اور آج ابن صفی کے مطالعہ میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے ؟

جواب: ابن صفی سے تعارف تو ڈل اسکول میں پڑھنے کے دوران ہوا جب بڑے بھائی، بہن اور کزنز کو پڑھتے دیکھا۔ میٹرک کرنے کے بعد پرانی کتابوں کی دکان سے ابن صفی کے جاسوسی ناول ملے تو خود سے پڑھنا شروع کیا۔ یہ 1980 s کی دہائی کے اولین سال تھے. ابنِ صفی کو ان کی وفات کے بعد سے باقاعدہ پڑھا. انھی دنوں " نئے افق "اور" نیا رخ "ڈائجسٹ میں بھی یہ ناول دوبارہ سے چھپنے لگے۔ ہم بہن بھائی صرف ان ناولوں کو پڑھنے اور جمع کرنے کی خاطر یہ دونوں ڈائجسٹ خرید اکرتے تھے. پھر گاہے بہ گاہے پڑھتے رہتے تھے۔ دوبارہ تمام ناول ترتیب وار سال 2020 میں کووڈ کی فرصت میں آن لائن منگوا کر پڑھے جب یہ نئی طرز سے پھر سے چھاپے گئے۔

پہلے اور سن 2020 میں پڑھنے کے درمیان چند دہائیاں گذر چکی تھیں مگر کہیں بھی یہ احساس نہ ہوا کہ یہ پرانی تحریریں ہیں. آج کے ماحول کی مطابقت موجود تھی. صرف اسمارٹ-فون اور سوشل میڈیا کی کمی محسوس ہوئی. اگر آج ابن صفی زندہ ہوتے تو ایک آدھ سیریز سائبر کرائم اور وار پر بھی مل جاتی۔

2۔ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب۔ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز میں کرداروں اور کام کرنے کے انداز میں فرق ہے. فریدی ایک سنجیدہ اور اسٹیریو ٹائیپ ہیرو ہے جب کہ عمران ایک نئے انداز کا، احمق دکھنے والا ہیرو ہے۔

3۔ آپ کس بنیاد پر ابن صفی کو اردو جاسوسی ادب میں سب سے بڑا نام مانتے ہیں؟ کیا ابن صفی کو صرف جاسوسی ادب کا مصنف کہنا ان کی ادبی حیثیت کو محدود کرنا ہے؟

جواب۔ ابنِ صفی اردو کے سب سے بڑے جاسوسی مصنف ہیں جس کا ثبوت ان کے ناولوں کا لاکھوں کی تعداد میں چھپنے اور بکنے، ان کی تحریروں کی خوبیوں کے علاوہ قارئین اور مصنف اور ان کے کرداروں کے درمیان ایک ایسا عجیب تعلق کا جڑنا بھی ہے جس میں محبت بھی تھی اور ان کی ناولوں کو پڑھنے کی جستجو بھی. ان کو پاکستان کے علاوہ انڈیا میں بھی شوق سے پڑھا جاتا تھا. اتنی شہرت اور محبت شاید ہی کسی اور ادبی یا جاسوسی مصنف کو نصیب ہوئی ہو۔

4-ابن صفی نے اپنے دور میں نوجوان نسل میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔۔ آج نوجوانوں میں یہ شوق پیدا کرنے اور ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کو نوجوانوں تک پہچانے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟

جواب۔ وہ دور تھا جب نوجوانوں میں مطالعے کا شوق تھا اور ان کے ہیرو شاعر اور مصنف ہوا کرتے تھے۔ اب انٹرنیٹ کا دور ہے. ہر دور کی اپنی اہمیت اور تقاضے ہوتے ہیں. اب انٹرنیٹ پر بھی نوجوان پڑھنے سے زیادہ وڈیوز دیکھتے ہیں. ان تک ابن صفی کے ناولوں کو اے آئی کی مدد سے فلمیں بنا کر پہنچایا جا سکتا ہے. یہ بہت بڑا پراجیکٹ ہو گا جس کے لئے قابل ٹیم چاہیے ہو گی. ابتداء میں ان کو متوجہ کرنے کے لئے ناولوں کے منتخب مناظر پر چھوٹی چھوٹی وڈیوز بنانی ہوں گی. خاص طور پر سائنس فکشن سیریز پر۔

5- آپ کے خیال سے ابن صفی کے جاسوسی ناول قارئین کو حقیقت سے دور تخیلاتی دنیا میں لے جاتے ہیں یا حقیقت پسند بناتے ہیں؟ کیا ان میں کوئی سماجی اور اخلاقی پیغام بھی موجود ہے؟

جواب: ابنِ صفی کے ناول پڑھنے والوں کو تخیلاتی دنیا میں بھی لے جاتے ہیں اور حقیقت پسند بھی بناتے ہیں۔ زیرو لینڈ کی جادو بھری دنیا (سائنسی دنیا) ایک نئے تصوراتی دنیا میں لی جاتی ہے جن میں سے کئی سائنسی ایجادات اب حقیقت بن چکی ہیں. بے خوف نڈر ہیروز تخیلاتی دنیا کے باسی لگتے ہیں مگر ان کے ارد گرد ان کے رشتے اور سماجی تعلقات اور کہانیوں کے مسائل حقیقی دنیا سے وابستہ لگتے ہیں۔ ان کے ناولوں کی کہانیاں سماجی اور اخلاقی مسائل کے گرد ہی بنی گئی ہیں. یہ جاسوسی سیریز ہونے کے باوجود ان میں خواہ مخواہ کے تھرل پیدا کرنے والے اور توجہ حاصل کرنے کے لئے اخلاق سے گرے ہوئے منظر نہیں ہوتے بلکہ فیملی فکشن ہوتا ہے جس کو گھر کے سارے افراد شوق سے پڑھتے ہیں۔

6۔ اکثر اہل علم کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان ابن صفی کے ناول پڑھ کر سیکھی۔ آپ کے خیال میں ابن صفی کی تحریروں میں ایسی کون سی خصوصیات تھیں جو قاری کو زبان سکھا دیتی تھیں؟

جواب۔ جن کی مادری زبان اردو نہیں تھی انہوں نے بھی ابن صفی کو پڑھا کیوں کہ انہوں نے نہ تو ثقیل اردو لکھی نہ ہی مشکل فلسفے دیئے. ان کی تحریریں سادہ اور عوامی زبان میں تھیں اس لئے جن کی زبان اردو تھی، یا اردو نہیں تھی، ابن صفی نے دونوں طبقوں کو اپنی تحریروں سے جوڑے رکھا۔

7- ابن صفی کے ناولوں کی ایک اہم خوبی ان کی بہترین کردار نگاری مانی جاتی ہے ان کرداروں میں کون سی خاص بات تھی جو آج بھی قارئین کے ذہنوں میں تر و تازہ ہیں؟

جواب۔ ابنِ صفی کے ناولوں کے کردار ہر قسم کے سماجی اسٹیٹس سے وابستہ تھے. شریف کردار، مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے، سائنسدان، شاطر مجرم، زندہ دل لڑکیاں... ان میں لوکل کردار بھی آ جاتے ہیں اور غیر ملکی بھی. ہمیں ان کی تحریروں میں کرداروں کی ورائٹی نظر آتی ہے. ان کی گفتگو بھی ان کے ذاتی اور سماجی حلقے کے مطابق ہوتی ہے. ایک طرف مستقل کردار ہیں دوسرے ہر نئی کہانی کے مطابق. ان کی فہرست لکھی جائے تو بہت طویل ہو جائے گی۔

8- آپ کی رائے میں ابن صفی کا بہترین مثبت کردار (عمران فریدی کے علاوہ) اور بہترین منفی کردار کون سا اور کیوں؟؟

جواب۔ مستقل کرداروں میں عمران اور فریدی کے علاوہ سر سلطان کا کردار مثبت ہے جو ایک شفیق آفیسر ہیں اور صرف انہوں نے ہی عمران کی صلاحیتوں کو پہچانا اور اسے ایکسٹو بنایا اور ہر ممکن تعاون کیا۔ منفی کرداروں میں مجھے سنگ ہی ناپسند ہے اور یہ کامیاب مصنف کا کمال ہے کہ منفی کرداروں کے لئے منفی تاثر پیدا کرے نہ کہ ایسے کرداروں کو گلیمرائز کرے. مجھے سنگ ہی کی تمام حرکتوں سے کوفت محسوس ہوتی ہے۔

9-ابن صفی کے قارئین میں کئی نسلیں شامل ہیں۔ ان ناولوں میں ایسا کیا ہے جو انہیں آج کے ماحول پر منطبق کرتی ہے؟

جواب۔ ابنِ صفی کے ناولوں کے موضوعات اور کردار آج کے دور کے کردار محسوس ہوتے ہیں کیونکہ وہ بہت ہی ترقی یافتہ معاشرے کے فرد ہیں جس میں سائنسی ترقی بھی ہے اور جدید طرز رہائش بھی۔ خاص طور پر لوکل لڑکیاں بھی روتی بسورتی، مہندی چوڑیاں پسند کرنے والی نہیں بلکہ مردوں کے شانہ بشانہ چلتی ہیں. جینز پہنتی ہیں، کار ڈرائیو کرتی ہیں، ماڈرن اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کے علاوہ سائنسی عجوبے اور تجربات آج کے دور کے لگتے ہیں۔

10۔ کیا ابن صفی کو اردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا عوامی ادیب قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب 1۔ بالکل. ابن صفی عوامی طبقے کے سب سے مقبول اور سب سے زیادہ پڑھے جانے والے مصنف تھے / ہیں جنہیں دو نسلوں نے پڑھا ہے اور ان کے ناولوں کے کئی ایڈیشن چھپے ہیں۔

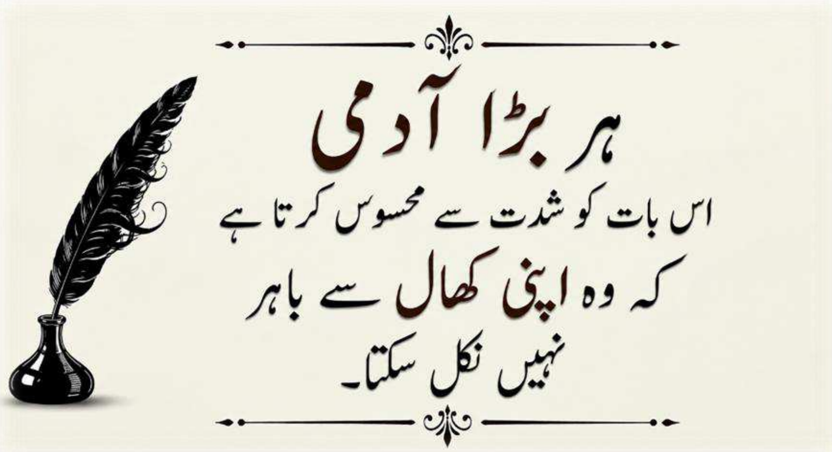

حمیرا ثاقب کا تعلق فیصل آباد پاکستان سے ہیں اور افسانہ نگاری ان کی پہچان ہے ۔ابن صفی کو کم عمری سے پڑھا ہے اور اپنے ادبی سفر میں ان سے متاثر رہی ہیں۔

1۔ آپ کا ابن صفی سے پہلا تعارف کیسے ہوا؟ اس وقت پڑھنے میں اور آج ابن صفی کے مطالعہ میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے؟

جواب- ابنِ صفی کا تعارف ہمارے ہوش سنبھالتے ہی گھر میں موجود تھا ابو جان، امی جان اور بڑی بہنیں سب ابنِ صفی کو پڑھتے اور ڈسکس کرتے تھے خصوصاً عمران کا کردار ہمارے گھر میں ایک فیملی ممبر کی طرح ڈسکس کیا جاتا تھا---اس وقت کے پڑھنے اور اب کے مطالعے میں سب سے بڑا فرق بچپن اور پچپن کا ہے بچے کے طور پر جی چاہتا تھا کہ ہم بھی عمران کی طرح بن جائیں ہم بھی جولیا ہوں----صفدر جیسے خاموش محبت کرنے والے اور جوزف جیسے جانثار ہوں----اب جبکہ سائنس ٹیکنالوجی اتنی ترقی کر گئی ہے ہم اب بھی کتاب ہاتھ میں لے اسی زمانے میں چلے جاتے ہیں جس میں ابنِ صفی نے کتابیں لکھیں تھیں ۔

2۔ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب۔ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز میں یہی فرق ہے جو عمران اور فریدی کی شخصیات میں فرق ہے ہم دونوں کو انجوائے کرتے ہیں عمران کا چلبلا پن جب حد سے بڑھ جاتا تو ہمیں سوبر اور ڈیسنٹ فریدی اچھا لگنے لگتا ہے اور جب ہم فریدی کے مافوق الفطرت پن سے بور ہو جاتے ہیں تو شرارتی سا عمران اچھا لگنے لگتا ہے----یہ دونوں انسانی طبیعت کی الگ الگ جہتیں ہیں اور ہمیں دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پسند ہیں۔

3۔ آپ کس بنیاد پر ابن صفی کو اردو جاسوسی ادب میں سب سے بڑا نام مانتے ہیں؟ کیا ابن صفی کو صرف جاسوسی ادب کا مصنف کہنا ان کی ادبی حیثیت کو محدود کرنا ہے؟

جواب۔ ابنِ صفی کو صرف سری ادب تک محدود کرنا زیادتی ہے اور ان کی تحریر کے دیگر پہلوؤں کو نظر انداز کرنا بھی درست نہیں ہے ہمیں ذاتی طور پر ابنِ صفی کی کردار نگاری اور منظر کشی بے حد پسند ہے-ایک ماہرِ نفسیات کی طرح انہوں نے انسانی نفسیات کی بے شمار جہتیں نمایاں کی ہیں اور ماحول کی منظر نگاری میں انہیں جو مہارت حاصل ہے وہ ہمیں کسی اور لکھاری کے ہاں نظر نہیں آتی-ہم جب بھی ایسے کسی منظر میں کھوئے ہوئے ہوں تو ان سے نکل کر بھی بہت دیر دل و دماغ اس کے حصار میں رہتا ہے--اردو کے جاسوسی ادب کے بے تاج بادشاہ ابن صفی ہی ہیں-ان کے بعد آنے والوں نے ان ہی کے راستے کو لے کر لکھا-نئ جہتیں ان لکھاریوں کے ہاں کم ہی نظر آتی ہیں۔

4-ابن صفی نے اپنے دور میں نوجوان نسل میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔۔ آج نوجوانوں میں یہ شوق پیدا کرنے اور ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کو نوجوانوں تک پہچانے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے ؟؟

جواب۔ویسے یہ سوال تو جوانوں سے ہی پوچھا جانا چاہیے کہ وہ کس فارم میں پڑھنا پسند کریں۔ہماری رائے میں تو کتاب ہاتھ میں پکڑ کر پڑھنے سے جو تسلی ہوتی ہے وہ پی ڈی ایف سے نہیں ہو سکتی اور ہمارے بچے بھی کتاب ہی سے پڑھنا پسند کرتے ہیں---باقی جدید میڈیم کو استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے ۔

5- آپ کے خیال سے ابن صفی کے جاسوسی ناول قارئین کو حقیقت سے دور تخیلاتی دنیا میں لے جاتے ہیں یا حقیقت پسند بناتے ہیں ؟ کیا ان میں کوئی سماجی اور اخلاقی پیغام بھی موجود ہے ؟

جواب۔یہ سوال دلچسپ ہے اس میں سماجی اور اخلاقی پیغام تو ہے ہی ہر مجرم آخر کار کیفرِ کردار تک پہنچتا ہے تو پیغام واضح ہے---البتہ یہ بات بیک وقت درست ہے کہ ابن صفی ہمیں تخیلات کے رتھ پر سوار کر کے کچھ دیر کے لیے دنیا کی بدصورتی سے دور لے جاتے ہیں اور ذہن ہلکا پھلکا ہو کر دوبارہ کام کے قابل ہو جاتا ہے----اور حقیقت پسندی یہ پیدا ہوتی ہے کہ ہر جرم کا انجام برا ہے اس لیے درست کام اور درست راستہ اختیار کرنا ضروری ہے۔

6۔ اکثر اہل علم کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان ابن صفی کے ناول پڑھ کر سیکھی۔ آپ کے خیال میں ابن صفی کی تحریروں میں ایسی کون سی خصوصیات تھیں جو قاری کو زبان سکھا دیتی تھیں ؟

جواب۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن صفی کی اردو اردوئے معلیٰ ہے-اور ہم نے پنجابی معاشرے میں رہتے ہوئے اپنی شین قاف انہیں پڑھ کر سنواری-ان کا ذخیرۂ الفاظ بہت اچھا ہے مترادفات اور متضاد دونوں طرح کے الفاظ کا تواتر سے استعمال ملتا ہے ان کے ہاں-دوسرے محاورات اور ان کا درست استعمال بھی زبان سیکھنے میں بہت اہم ہوتا ہے-اور ہمیں ذاتی طور پر جب وہ کسی کی شخصیت کا نقشہ کھینچتے ہیں تو وہ بہت پسند ہے اور ان کے الفاظ ہم نے اپنی زندگی میں بہت برتے-عام زندگی میں روزمرہ میں-جس نے ہماری اردو کو دن بدن بہتر سے بہتر بنایا۔

7-ابن صفی کے ناولوں کی ایک اہم خوبی ان کی بہترین کردار نگاری مانی جاتی ہے ان کرداروں میں کون سی خاص بات تھی جو آج بھی قارئین کے ذہنوں میں تر و تازہ ہیں ؟

جواب۔ کردار نگاری ابن صفی کی بہت بڑی خوبی ہے---اور ان کرداروں کی سب سے بڑی خصوصیت ہمیں یہ لگتی ہے کہ وہ عام معاشرے میں چلتے پھرتے انسان محسوس ہوتے ہیں--ان کی شخصیت ایک انسان کی طرح خامیوں اور خوبیوں کا مجموعہ ہوتی ہے اور وہ لفظوں سے شکل وصورت اور چال ڈھال کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ وہ انسان مجسم محسوس ہونے لگتا ہے----یہ خوبی ہمارے خیال میں آج بھی سوچتے ہی ان کرداروں کو ہمارے ذہن میں تازہ کر دیتی ہے ۔

8- آپ کی رائے میں ابن صفی کا بہترین مثبت کردار (عمران فریدی کے علاوہ) اور بہترین منفی کردار کون سا اور کیوں ؟؟

جواب۔ابن صفی کے کسی ایک کردار کو بتانا ہمارے لیے مشکل ہے---لیکن مثبت میں ہمیں صفدر سب سے زیادہ پسند ہے---عمران پر غیر متزلزل یقین صفدر کو ڈارلنگ بنا دیتا ہے---اور منفی میں ہمیں فراگ کا کردار بہت متاثر کن لگتا ہے جس سے بیک وقت نفرت اور ہمدردی محسوس ہوتی ہے اس کی ذات کی کمیاں اس سے ہمدردی پیدا کرواتی ہیں اور اس کی گھٹیا حرکتوں کی وجہ سے اس سے الجھن اور نفرت محسوس ہوتی ہے

9-ابن صفی کے قارئین میں کئی نسلیں شامل ہیں۔ان ناولوں میں ایسا کیا ہے جو انہیں آج کے ماحول پر منطبق کرتی ہے ؟

جواب۔ان ناولوں میں موجود وہ آفاقی اصول آج بھی اتنے ہی اہم ہیں جو نسلوں پہلے تھے---جرم سے بچنا اور غلط راستے اختیار نہ کرنا آج بھی اتنا ہی اہم ہے-اور یہ پیغام کہ، ہر جرم کا مقدر قانون کی گرفت ہے،ان کے پیغام کو ہر دور کے لیے تابندہ کر دیتا ہے ۔

10۔کیا ابن صفی کو اردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا عوامی ادیب قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب۔جی بلاشبہ کہا جاسکتا ہے اور ایسی شہرت جس کو کئی دہائیوں کے بعد بھی وہی عروج حاصل ہے----تو یہ اس کا ثبوت ہے کہ وہ پسندیدہ عوامی ادیب ہیں---اور ایسا ادیب جس کو پڑھنے کے لیے آپ کو کوئی اصرار نہیں کر سکتا بلکہ آپ اپنی مرضی سے اسے پڑھتے ہیں--دہائیوں سے ان کی کتابیں تکیوں کے نیچے پائی جاتی ہیں-یہ عوامی پن نہیں تو پھر اور کیا ہے۔

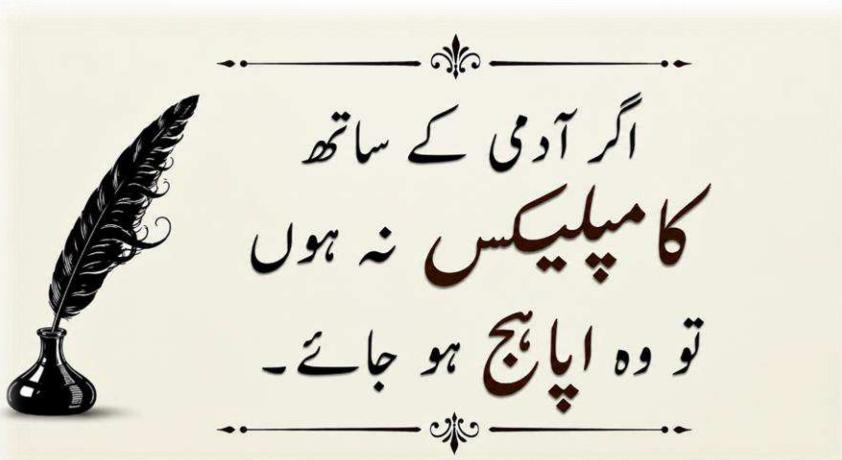

سمیرا عابد کا تعلق لاہور سے ہے آرکیٹیکچر کے شعبہ میں تعلیم حاصل کی اور اسے بطور پروفیشن اپنایا۔ ابن صفی سے محبت انہیں وراثت میں ملی ہے اور ابن صفی کی تحریروں پر ان کی گرفت قابل تعریف ہے۔

1. آپ کا ابن صفی سے پہلا تعارف کیسے ہوا؟ اس وقت پڑھنے میں اور آج ابن صفی کے مطالعہ میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے ؟

جواب۔ میرے والد صاحب ابن صفی کے مستقل قاری اور مداح تھے۔ ہمارے گھر میں جابجا ابن صفی کی کتابیں پائی جاتی تھیں لیکن امی جان کو لگتا تھا کہ بچوں کو انہیں نہیں پڑھنا چاہیے۔ لہٰذا پرائمری کے بعد پڑھنے کی اجازت ملی۔ شروع یہ یاد نہیں کہ کون سی کتاب پڑھی تھی۔ تاہم میٹرک میں زیادہ تر کتابیں ترتیب وار پڑھ لیں۔ اس وقت پڑھنے میں یہ حیرت کا ایک جہاں لگتا تھا۔ اور اب پڑھنے میں ایک تھراپی کی طرح محسوس ہوتا ہے۔

2. جاسوسی دنیا اور عمران سیریز میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب۔ میرے لئے دونوں ہی پسندیدہ ہیں۔ میرا خیال ہے بڑا فرق فریدی کا مقامی انٹیلیجنس سے منسلک ہونا اور عمران کا محکمہ خارجہ کی سیکرٹ سروس کا حصہ ہونا تھا۔ لہٰذا جرم کی نوعیت مختلف ہوتی تھی۔

3. آپ کس بنیاد پر ابن صفی کو اردو جاسوسی ادب میں سب سے بڑا نام مانتے ہیں؟ کیا ابن صفی کو صرف جاسوسی ادب کا مصنف کہنا ان کی ادبی حیثیت کو محدود کرنا ہے؟

جواب۔ بہت سی وجوہات ہیں جو ابن صفی کو اردو جاسوسی ادب کا بڑا نام بناتی ہیں۔ -پہلی بات یہ کہ وہ حقیقتاً pioneer تھے۔

انہوں نے کردار تخلیق کیے، ان کے ارد گرد فضا تخلیق کی اور ایک الگ دنیا کو جنم دیا۔ ان کی تحریر ادب کا اعلیٰ نمونہ ہوتی تھی۔ بعد میں آنے والے ہر جاسوسی ناول نگار کے لئے ان کے سحر اور ان کی بنائی گئی فضا سے انحراف کرنا ممکن نہیں رہا۔ -بہت بڑی تعداد میں مصنفین نے ان کے کردار برائے اور برسوں ان کے نام پر کمائی کی۔ -بہت سے لکھنے والوں نے ان کی عظمت کا اعتراف کیا۔

جی، بالکل۔ اگر مزاحیہ ادب کو ادب کا حصہ مانا جاتا ہے تو ابن صفی کے مزاح پارے اور جاسوسی ناولوں کے اقتباسات اعلیٰ درجے کا مزاح پیش کرتے ہیں جو ابتذال سے پاک ہے۔ اگر خوبصورت نثر نگاری ادب کہلاتی ہے تو ابن صفی کی نثر بہترین ہے۔ اگر کہانی سازی اور سسپنس کے ذریعے فکشن پیش کی جاتی ہے تو ابن صفی کی کہانیاں اس کا شاہکار ہیں۔

4. ابن صفی نے اپنے دور میں نوجوان نسل میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔۔ آج نوجوانوں میں یہ شوق پیدا کرنے اور ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کو نوجوانوں تک پہچانے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے ؟؟

جواب۔ شاید بصری پیشکش۔ لیکن ہمارے لئے وہ کتاب میں ہی بہتر ہیں۔

5. آپ کے خیال سے ابن صفی کے جاسوسی ناول قارئین کو حقیقت سے دور تخیلاتی دنیا میں لے جاتے ہیں یا حقیقت پسند بناتے ہیں ؟ کیا ان میں کوئی سماجی اور اخلاقی پیغام بھی موجود ہے ؟

جواب۔ ابن صفی کی کتب میں جابجا سماجی اور اخلاقی پیغامات موجود ہیں۔ تخیل میں بھی وہ قانون کی عملداری کا ہی درس دیتے ہیں۔ اور تخیل کی دنیا میں بھی انہوں نے زمینی حقائق کو پیش نظر رکھا ہے۔ غیر حقیقی صرف وہ اختتام ہوتے ہیں جن کی ہم اصل زندگی میں آرزو کرتے ہیں لیکن یہ فکشن کی مجبوری ہے۔ اور اس کا اثر کیا ہو گا۔۔۔ کوئی نہ کوئی خود کو عمران یا فریدی سمجھ کے جرم کے خلاف کھڑا ہو جائے گا۔

اب جس کے دل میں آئے، وہی پائے روشنی

ہم نے تو دل جلا کے سرِ راہ رکھ دیا۔

6. اکثر اہلِ علم کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان ابن صفی کے ناول پڑھ کر سیکھی۔ آپ کے خیال میں ابن صفی کی تحریروں میں ایسی کون سی خصوصیات تھیں جو قاری کو زبان سکھا دیتی تھیں ؟

جواب۔ کہانی کی دلچسپی۔۔ ظاہر ہے کہ کوئی ابن صفی کو زبان سیکھنے کے لئے نہیں پڑھتا تھا۔ یہ کہانی تھی جو چپکے سے سکھاتی تھی۔

7. ابن صفی کے ناولوں کی ایک اہم خوبی ان کی بہترین کردار نگاری مانی جاتی ہے ان کرداروں میں کون سی خاص بات تھی جو آج بھی قارئین کے ذہنوں میں تر و تازہ ہیں ؟

جواب۔ اس سوال کا جواب مختصراً دینا مشکل ہے۔ تاہم کم۔ سے کم الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے، "تنوع"... ان کے کردار ہمارے ماحول کا حصہ بھی تھے اور منفرد بھی۔

8. آپ کی رائے میں ابن صفی کا بہترین مثبت کردار (عمران فریدی کے علاوہ) اور بہترین منفی کردار کون سا اور کیوں ؟؟

جواب۔ بہترین مثبت کردار شاید جوزف۔۔۔ اپنی سادگی اور خلوص کے لئے، یا پھر صفدر، اپنی بہترین صلاحیتوں کے لئے ۔

بہترین منفی کردار۔۔۔ فنچ۔۔۔ اس کی منفیت صرف ڈاکٹر ڈریڈ تک محدود رہی۔۔۔ اسی لئے دوبارہ اس کا آنا مجھے پسند نہیں آیا۔

9. ابن صفی کے قارئین میں کئی نسلیں شامل ہیں۔ ان ناولوں میں ایسا کیا ہے جو انہیں آج کے ماحول پر منطبق کرتی ہے ؟

جواب۔ تجسس اور اسرار کا کوئی دور نہیں ہوتا۔ وہ کہیں بھی اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔

10۔ کیا ابن صفی کو اردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا عوامی ادیب قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب۔ ایسا دعویٰ محبت کی بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا جب تک اسے اعداد و شمار سے ثابت نہ کیا جائے۔ جو معلومات دستیاب ہیں، ان کی بنا پر یہ دعویٰ درست محسوس ہوتا ہے۔

تاہم سوشل میڈیا کے دور میں ان کی فنی عظمت کو ایسے کسی دعوے کی تصدیق و تنکیر کی نذر نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے لئے وہ بہترین ہی ہیں۔

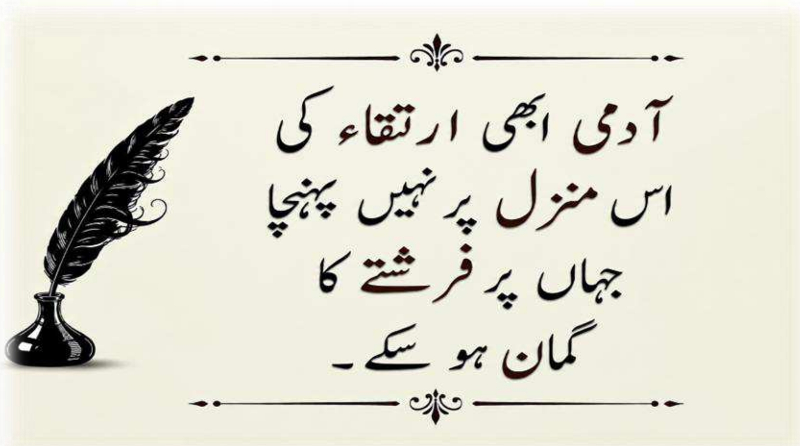

کرن صدیقی کا تعلق کراچی ہے۔ کیریئر کا آغاز بطور معلم کیا۔ کالم نگاری، ادبی شخصیات کے انٹرویوکیے اور سماجی افراد، فلمی شخصیات کے بارے میں مضامین، افسانچہ، بچوں کی کہانیاں سمیت ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے ان کی تحریریں سرگزشت، ادب لطیف، نوائے وقت اور مختلف اخبارات اور رسالوں کے علاوہ انڈیا کے اخبارات میں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔

1۔ آپ کا ابن صفی سے پہلا تعارف کیسے ہوا؟ اس وقت پڑھنے میں اور آج ابن صفی کے مطالعہ میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے؟

جواب۔ بالکل ٹھیک سے تو یاد نہیں کہ پہلی مرتبہ ابنِ صفی کو کب پڑھا لیکن یہ ضُرور یاد ہے کہ ابنِ صفی کو میں پہلی مرتبہ پرائمری اسکول کے دنوں میں ہی پڑھا تھا۔ اس بارے میں سوچوں تو جو پہلی یاد ہے وہ یہ کہ میرے پاپا کی لائبریری میں ہر قسم کی کتابیں ہوتی تھیں تو پہلے شاید نئے اُفق اور نیا رُخ کے آخری صفحات میں ان کے ناول پڑھے پھر بعد میں الگ سے ناول پڑھے۔

2۔ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب۔ کوئی فرق نہیں ہے ہاں انداز الگ ضُرور ہیں دونوں ناولوں کے ہیروز کے لیکن مُبادیات ایک ہی ہے۔

3۔ آپ کس بنیاد پر ابن صفی کو اردو جاسوسی ادب میں سب سے بڑا نام مانتے ہیں؟ کیا ابن صفی کو صرف جاسوسی ادب کا مصنف کہنا ان کی ادبی حیثیت کو محدود کرنا ہے؟

جواب۔ دیکھئے کسی بھی تخلیق کار کی صلاحیتیں ہی فن کی دُنیا میں اُس کے مقام کا تعیُّن کرتی ہیں۔ ابنِ صفی کا فن ہی اُنھیں عظیم بناتا ہے۔ جیسا ماحول اور جیسی کہانی میں پڑھنا چاہتی ہوں وہ مجھے اُن کے یہاں ملی اور میرے دل کو چھو گئی یوں کہیں کہ مجھے مسحور کر دیا۔ کچھ اور لوگوں نے بھی جاسوسی ناول لکھے لیکن ابنِ صفی کی بات ہی اور ہے۔ صرف میں ہی نہیں ہر اچھّا ادب خاص کر اچھّا جاسوسی ادب پڑھنے والا انھیں اردو کے جاسوسی ادب کا سب سے بڑا نام کہے گا۔ جہاں تک بات سوال کے دوسرے حصے کی ہے تو یہ بھی سب جانتے ہیں کہ وہ صرف جاسوسی ادب سے ہی وابستہ نہیں تھے۔ اُن کی حسِ مزاح نے اُن سے تُزکِ دوپیازی جیسی شان دار اور بے مثال مزاحیہ تحریریں لکھوائیں۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ اُن کی شاعری بھی بہت اعلیٰ ہے اور کیوں نہ ہو نوح ناروی کے جو خواہر زادے تھے۔

" جو کہہ گئے وہ ہی ٹھہرا ہمارا فن اسرار

جو کہہ نہ پائے، وہ چیز نجانے کیا ہوتی"

تو یوں ہے کہ فن اپنے اظہار کی راہیں خُود تلاش کر لیتا ہے۔ ابنِ صفی کا تخلیق کا سوتا اتنا زبردست تھا کہ انھوں نے قدرتِ فن کا اظہار نثر اور شاعری دونوں طرح کیا۔ نثر میں زیادہ شاعری میں کم۔

4۔ ابن صفی نے اپنے دور میں نوجوان نسل میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔۔ آج نوجوانوں میں یہ شوق پیدا کرنے اور ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کو نوجوانوں تک پہنچانے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟؟

جواب۔ جہاں تک ہو سکے ان کے ناولوں اور دیگر تحریروں کو نوجوان نسل تک پہنچایا جائے۔ اس سلسلے میں جدید ذرائع ابلاغ یعنی سوشل میڈیا کے مختلف پلیٹ فارمز پہ ابنِ صفی کے ناولوں کو چھوٹے ٹکڑوں میں صوتی اور ڈرامائی صورت میں پیش کیا جائے ساتھ ہی تحریر بھی ہو۔ اس سلسلے میں اے آئی سے مدد لی جائے جیسے آج کل مختلف کہانیاں اے آئی کی مدد سے پیش کی جا رہی ہیں اور لوگوں کو بہت پسند آ رہی ہیں تو یہ چیز یقیناً نئی نسل کو مطالعے خصوصاً ابنِ صفی کی تحریروں کی طرف راغب کرنے میں مُعاون ثابت ہو گی لیکن بس اتنا خیال رکھنا ہو گا بعض کرداروں کی صورت واضح نہ ہو ورنہ لوگوں کو اعتراض ہو گا۔

5۔ آپ کے خیال سے ابن صفی کے جاسوسی ناول قارئین کو حقیقت سے دور تخیلاتی دنیا میں لے جاتے ہیں یا حقیقت پسند بناتے ہیں؟ کیا ان میں کوئی سماجی اور اخلاقی پیغام بھی موجود ہے؟

جواب۔ اِس میں تو کوئی دو رائے ہے ہی نہیں کہ ابنِ صفی کی تحریریں تفریح فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ تربیت کا کام بھی کرتی ہیں۔ ان کے ناولوں میں آج کل کے لکھنے والوں کی طرح بلاوجہ اور زبردستی کی نصیحتیں نہیں ٹھونسی گئیں۔ ان کی تحریر کی پوری فضاء غیر محسوس طریقے سے سماجی اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کا ایسے پرچار کرتی ہیں کہ قاری انھیں لاشعوری طور پر خُود بخود اپنا کے اپنی شخصیت کا حصّہ بنا لیتا ہے۔

6۔ اکثر اہلِ علم کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان ابن صفی کے ناول پڑھ کر سیکھی۔ آپ کے خیال میں ابن صفی کی تحریروں میں ایسی کون سی خصوصیات تھیں جو قاری کو زبان سکھا دیتی تھیں؟

جواب۔ دُرست ہے لیکن جہاں تک میں سمجھتی ہوں اس بات کا ایک اور پہلو بھی ہے وہ یہ کہ زبان صرف درست محاورہ بولنے کا ہی نام نہیں بلکہ درست انداز میں بات کرنے کا بھی نام ہے۔ یہ بات ہمیں ابنِ صفی کی تحریروں میں بہت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ بڑے چھوٹے کا احترام، فحش، ذُو معنی اور غلط الفاظ سے احتراز موقع محل کے اعتبار سے گفت گو، میرے خیال سے تو یہ ہی وہ خصوصیات ہیں جو قاری کو اچّھی زُبان کا استعمال سِکھاتی ہیں۔

7۔ ابن صفی کے ناولوں کی ایک اہم خوبی ان کی بہترین کردار نگاری مانی جاتی ہے ان کرداروں میں کون سی خاص بات تھی جو آج بھی قارئین کے ذہنوں میں تر و تازہ ہیں؟

جواب۔ ان کے ہر کردار میں خاص بات مہذّب گفت گو اور بے ہودہ زبان سے پرہیز ہے خواہ وہ کسی غنڈے کا ہی کردار ہو لیکن وہ گندے الفاظ کا استعمال نہیں کرتا۔ یہ اُن کی تحریروں کی بہت نمایاں خصوصیت ہے۔

8۔ آپ کی رائے میں ابن صفی کا بہترین مثبت کردار (عمران فریدی کے علاوہ) اور بہترین منفی کردار کون سا اور کیوں؟

جواب۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ ان کا ہر کردار خواہ وہ منفی ہو یا مثبت، اپنی جگہ بہترین ہے چاہے وہ کتنا چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو۔ مجھے ان کے تمام کردار اچھے لگتے ہیں۔

9۔ ابن صفی کے قارئین میں کئی نسلیں شامل ہیں۔ ان ناولوں میں ایسا کیا ہے جو انھیں آج کے ماحول پر منطبق کرتی ہے؟

جواب۔ جب کوئی شخص صِدق دل سے کوئی کام کرتا ہے تو اللہ اسے لوگوں میں مقبول بنا دیتا ہے۔ انھوں نے ایک اچھے مقصد شعبہ اختیار کیا کہ نوجوانوں کو فحاشی سے بچانا تھا۔ ان کی نیت اچھی تھی اللہ پاک نے انھیں آج تک لوگوں کے ذہنوں میں زندہ رکھا ہوا ہے اور ہمیشہ وہ اسی طرح چاہے جاتے رہیں گے۔ اس کے علاوہ ان کے ناول آنے والے

وقت کی تصویر پیش کرتے تھے جو باتیں اس وقت محض خواب لگتی تھیں اب وہ سچ ہو گئیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ اتنے عشروں بعد بھی ان ناولوں کی مقبولیت کم نہیں ہوئی ہے لوگ انھیں پڑھ کے آج بھی اپنے ماحول سے ہم آہنگ محسوس کرتے ہیں۔

10۔ کیا ابن صفی کو اردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا عوامی ادیب قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب۔ میرا خیال ہے عشروں بعد بھی اگر کسی کی تحریریں اتنے ذوق و شوق سے مسلسل پڑھی جاتی ہیں تو وہ کوئی اور نہیں ابنِ صفی ہی ہیں۔ انھیں پڑھنے والوں اور ان کے مدّاحین میں ہر طرح کے ہر طبقے کے لوگ ہیں اِس حوالے سے دیکھا جائے تو واقعی وہ سب سے زیادہ پڑھے جانے والے عوامی ادیب ہیں۔

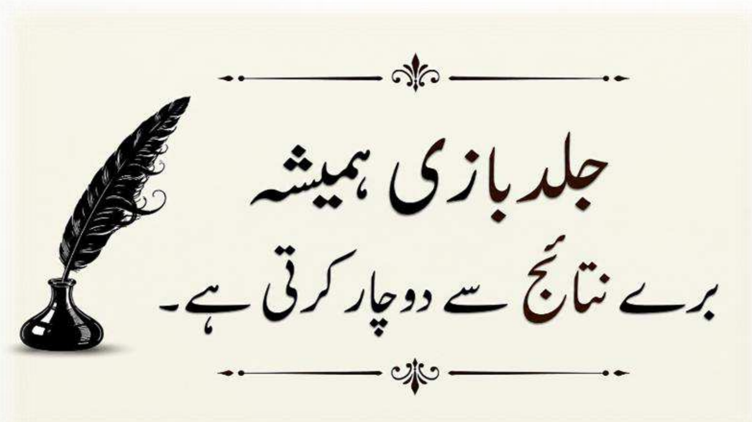

سیدہ شہلا شکور کا تعلق اسلام آباد اور کراچی سے ہے۔ہم نیٹ ورک پر کہانیاں ڈرامے، لکھتی ہیں ان کی ابن صفی سے گہری وابستگی رہی ہے۔

1۔ آپ کا ابن صفی سے پہلا تعارف کیسے ہوا؟اس وقت پڑھنے میں اور آج ابن صفی کے مطالعہ میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے۔

جواب۔اس گھر میں جہاں ہم نے نے آنکھ کھولی ۔جہاں امی فریدی کی فین ہوں عمران ابو کا چہیتا ہو ۔امی کو فادر ہارڈاسٹون کے اصول پسند ہو۔ ابو کو عمران کی بے قاعدگی اور بے فکری بھاتی ہو ۔امی کو بلیک فورس کے ہیڈ کا کردار پسند ہو تو ابو کو ایکس ٹو کی ہمہ وقت جاگتی ذہانت، اب بھلا بتایئے ایسے ماحول میں پرورش پانے والے خوش نصیب بچوں کا ابن صفی سے تعارف کسی بیرونی وسیلے کا کیوں محتاج ہوتا؟تو جناب،ہم ابن صفی کی عمران سیریز اور جاسوسی دنیا کے ان زخائر تک رسائی حاصل کرتے گئے اور یہ خزانہ ہمارے والدین کی گھر میں موجود لائبریری کا ایک شیلف۔

آخری آدمی کی اشاعت اور صفی صاحب کی رحلت کی خبر گویا ہمارے والدین کے لیئے بھی سانحہ تھی۔اس واقعے کے چند سال بعد ابو کے تکیے کے نیچے سے ایک کتاب بر آمد ہوئی" ایڈلاوا"۔۔۔اور ہماری اس وقت کی علمی قابلیت بس پرائمری والی یہ تھی کہ اس کتاب کو کورس کی کتاب میں چھپا کر کئی گھنٹے لگا کر پڑھنے کے باوجود سوائے اس کے کچھ سمجھ نہ آیا کہ عمران ہیرو ہے۔یہ تھا پہلا تعارف۔

تب یا اب پڑھنے میں صرف یہ فرق آیا کہ تب ہم تجسس اور انٹرٹیمنٹ کے لیے پڑھا کرتے تھے آج موقع نکال کر چند گھڑیاں ریلیکس ہونے اور کسی پر مزاح مگر گہری بات پر بے ساختہ مسکرانے کے لیے پڑھتے ہیں۔تب رویوں کی سمجھ کم تھی آج ان کرداروں نے شخصیات کو سمجھنا آسان کر دیا ہے اگر عہد صفی میں رہ کر پڑھ نہ پائے تو کیا غم وہ خزانہ تو آج تک سلامت ہے جو اس عہد کو آج بھی ہمارے لیے قائم رکھے ہوئے ہے ۔

2۔جاسوسی دنیا اور عمران سیریز میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں۔

جواب۔ بس یہی فرق کہ عمران ہم خود ہیں اور فریدی ہمارا آئیڈیل ۔

3۔ آپ کس بنیاد پر ابن صفی کو اردو جاسوسی ادب میں سب سے بڑا نام مانتے ہیں ؟ کیا ابن صفی کو صرف جاسوسی ادب کا مصنف کہنا ان کی ادبی حیثیت کو محدود کرنا ہے ؟

جواب۔ نصف صدی کی عمر گزار کر ہم نے آج تک اردو زبان میں جاسوسی ادب کی دنیا میں کسی اور نام کی یہ عزت نہیں دیکھی کہ نسل در نسل ان ناولز کو اتنے ہی ذوق وشوق سے آج تک پڑھا جا رہا ہے۔ ان کے کرداروں۔ کہانیوں اور نظریات پر یونیورسٹی کے مقالے لکھے جا رہے ہوں۔ یہ سب بطور ادیب خود ہی ان کے ادبی مقام کا تعین کر دیتے ہیں۔

4۔ ابن صفی نے اپنے دور میں نوجوان نسل میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔۔ آج نوجوانوں میں یہ شوق پیدا کرنے اور ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کو نوجوانوں تک پہچانے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟؟

جواب۔ آڈیو بکس اچھا طریقہ ہے۔ مگر تلفظ درست ہونا چاہیے۔ مگر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ جین زی اور الفا فلموں کے شوقین ہیں اگر ان ناولز کو اینیمیشن فلموں میں بنایا جائے ۔ تا کہ ہمارے جیسے فینز اپنے پسندیدہ کرداروں کو اگر ناپ تول میں کم پائیں تو اینیمیشن کا مارجن دے سکیں ۔
آوازوں اور مختلف زبانوں کو سب ٹائیٹلز کے ساتھ ڈائیلاگز میں دکھایا جائے اسکرین پلے کی تفصیلات ناولز سے درست لی جائیں ، شکرال ہو یا زیرو لینڈ مریخ ہو یا ٹھنڈا سورج سب کچھ بنا کر اس نسل کو ابنِ صفی کا فین بنایا جا سکتا ہے۔ مارول اور ڈی سی کی دنیا سے نکالا جا سکتا ہے۔ یہ بس میرا خیال ہے۔
ڈائیلاگ بس اس سے ہی لکھوایا جائیں جو ان ناولز میں بین السطور مزاح اور اخلاقی پیغام کو سمجھ سکتا ہو۔

5۔ آپ کے خیال سے ابن صفی کے جاسوسی ناول قارئین کو حقیقت سے دور تخیلاتی دنیا میں لے جاتے ہیں یا حقیقت پسند بناتے ہیں؟ کیا ان میں کوئی سماجی اور اخلاقی پیغام بھی موجود ہے؟

جواب ۔ تخیلاتی دنیا بھی تو ہماری حقیقت سے ہی اٹھائی جاتی ہے۔ اگر ہمارے ارد گرد عمران اور فریدی جیسے لوگ نہ ہوں تو شاید یہ معاشرہ رہنے کے قابل ہی نہ رہے۔
اپنے والدین کے بعد ہماری شخصیت کو بنانے میں سب سے اہم کردار ابن صفی کا ہے، اپنے وطن سے شدید محبت، وفاداری اور ملکی سلامتی کی خواہش ہمیں ان کے کرداروں سے ملی۔ انسانیت، مذہب اور قومیت کے بارے میں تصورات کی شکل واضح کرنے میں بھی یہی کردار مددگار بنے۔ تو آج بھی یہ حوالہ سب کے لیے ہے

6۔ اکثر اہل علم کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان ابن صفی کے ناول پڑھ کر سیکھی۔ آپ کے خیال میں ابن صفی کی تحریروں میں ایسی کون سی خصوصیات تھیں جو قاری کو زبان سکھا دیتی تھیں؟

جواب ۔ انداز بیاں کی روانی۔ سادگی۔ برجستگی۔ شستہ مزاح بر محل تشبیہات اور استعارے، اور ہلکا سا شاعری کا رنگ۔

7۔ ابن صفی کے ناولوں کی ایک اہم خوبی ان کی بہترین کردار نگاری مانی جاتی ہے ان کرداروں میں کون سی خاص بات تھی جو آج بھی قارئین کے ذہنوں میں تر و تازہ ہیں؟

جواب۔ حقیقت سے قریب کردار جنگی گفتگو یا سرگرمیوں کا دائرہ کار لارجر دن لائف نہیں ہے۔ وہ سب انسان ہیں سپر ہیروز نہیں۔ شاعری پر بات کرتے ہیں۔ سیاست پر نظر رکھتے ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی مسائل کی سمجھ بوجھ ہے۔ دکھ اور تھکن محسوس کرتے ہیں۔ زخم بھی لگتے ہیں اور صحت یابی بھی وقت لیتی ہے ہیں ۔ دھوکہ بھی کھا جاتے ہیں ۔ صنف مخالف سے متاثر ہوتے ہیں مگر اپنے مشن کی راہ میں رکاوٹ بننے نہیں دیتے۔ یہ عوامل انہیں دل و دماغ میں تازہ رکھتے ہیں ۔

8۔ آپ کی رائے میں ابن صفی کا بہترین مثبت کردار (عمران فریدی کے علاوہ) اور بہترین منفی کردار کون سا اور کیوں؟؟

جواب۔ مثبت کردار: روشی۔۔۔ عمران کی اصل حیثیت سے واقف ہونے کے باوجود اس راز کو نہ تو کبھی ظاہر کیا نہ ہی اپنے رویئے میں کوئی تبدیلی لائی۔ ایک وفادار پر خلوص دوست جو صرف دوستی نبھانا جانتا ہے۔ اسے نہ تو عہدے کے مفادات سے غرض ہے نہ ہی اس راز کے بدلے دشمنوں سے سودے بازی کی سوچ آتی ہے

منفی کردار : ایک تہ دار کردار تھریسیا بمبل بی: ذہین اور حسین ترین مجرمہ۔ مگر عمران کے لیے دل میں محبت، اس کو بچانے کے لیے اپنی تنظیم سے غداری کی مرتکب۔ مگر اپنی ذہنی اور معاشی برتری جتانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی ہے، دل سے منتظر ہے کہ عمران اس کے دنیا پر حکمرانی کے منشور سے قائل ہو جائے۔ عمران کی فیملی یا اس کے ماتحتوں کو اختیار ہونے کے باوجود نقصان نہیں پہنچاتی ہے ۔ مجھے یہ احساس بھی ہوا ہے کہ یہ شاید وہ واحد مجرمہ ہے جو عمران کو بحیثیت ایکسٹو بھی جانتی ہے ۔ مگر اس راز کو وہ اپنی تنظیم کے کاز اور مفاد سے زیادہ عمران کی سلامتی کے لیے دل میں رکھتی ہے۔ یہ بھی بس میرا خیال ہے ۔ عمران بھی اس کو اپنے ملک سے باہر چھوٹ دے دیتا ہے۔ ملکی مفادات کے لیے اس کو استعمال بھی کرتا ہے۔ موقع ملنے کے باوجود جان سے نہیں مارتا۔ ذہانت کو سراہتا بھی ہے۔

9۔ ابن صفی کے قارئین میں کئی نسلیں شامل ہیں۔ ان ناولوں میں ایسا کیا ہے جو انہیں آج کے ماحول پر منطبق کرتی ہے؟

جواب۔ مستقبل کی تصویر کشی۔ جدید آلات کا استعمال۔ حقیقت سے قریب ایکشن 1952 سے 1977 س دورانیے میں جو کچھ بھی جدید ٹکنالوجی ناولز میں بتائی گئی آج وہ سب ہمارے استعمال میں ہیں۔ وائرلیس فون سے لے کر ڈرون تک ۔۔

ایٹمی توانائی سے لی کر مصنوعی ذہانت اور کیمسٹری کا تڑکہ بھی۔۔۔

کسی طرح سے بھی ہالی ووڈ کی میگا بجٹ سپر ایجنٹ والی فلموں سے کم ایڈوانچر نہیں ہے ۔

10۔ کیا ابن صفی کو اردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا عوامی ادیب قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب ۔ اگر عوامی ادیب کی سب سے بہتر تعریف یہی ہے کہ ہر عمر کے قاری اسے یکساں شوق سے پڑھیں اور بار بار پڑھیں اور ہر بار انجوائے کریں ۔ تو بلا شبہ سات دہائیوں سے تو ان ناولز کی نہ تو چھپائی رکی ہے نہ نئے قارئین کی شمولیت ختم ہوئی ہے اور نہ ہی پڑھائی میں کمی آئی ہے۔۔۔ تو میرے نزدیک وہ عوامی درجے سے بھی بلند درجے قومی ادیب پر ہیں۔

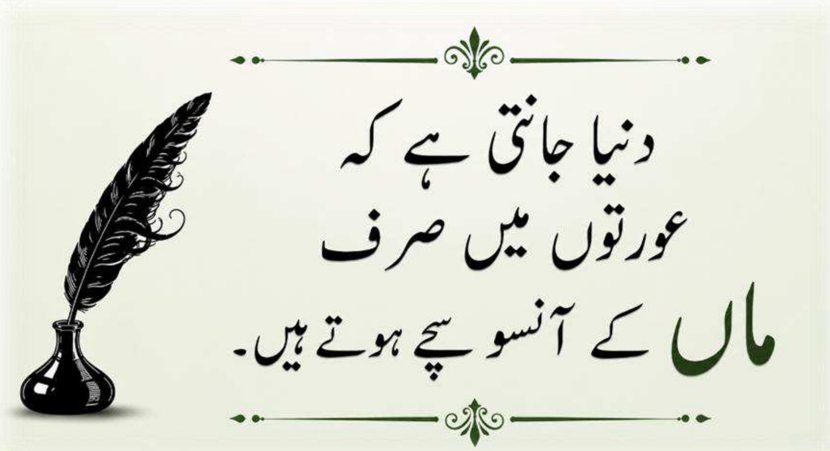

طاہر انجم صدیقی کا تعلق مالیگاوں انڈیا سے ہے ایک باصلاحیت افسانہ نگار ہونے کے ساتھ شاعری، تحقیق و تنقید، طنز و مزاح، بچوں کا ادب، رپورتاژ، علمی مضامین، انشائیے، خاکے، ڈرامے اور صحافت سے تعلق رہا ہے۔ ان کی تحریریں بے باک، تکمیل، قرطاس، شگوفہ اور اردو آنگن جیسے رسالوں اور انقلاب، ممبئی اردو نیوز، اردو ٹائمز، صحافت، سہارا، اودھ نامہ جیسے معتبر اخبارات میں میں شائع ہوتے رہے ہیں اور کئی اعزاز سے نوازے جا چکے ہیں۔

1۔ آپ کا ابن صفی سے پہلا تعارف کیسے ہوا؟ اس وقت پڑھنے میں اور آج ابن صفی کے مطالعہ میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے ؟

جواب- میں چھوٹا تھا تو گھر میں گلابی کرن، پاکیزہ آنچل وغیرہ پڑھا کرتا تھا لیکن چھٹی یا ساتویں جماعت کے دوران میرے ایک دوست کے توسط سے ابن صفی کا ناول ہاتھ آیا اور ایسا آیا کہ پھر ابن صفی کا ساتھ نہیں چھوٹا. میں ابن صفی کے ناولوں کی انگلی پکڑے اردو ادب کی جانب چلا آیا ہوں۔

2۔ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب۔ اگر آپ کی مراد فریدی اور عمران سیریز سے ہے تو دونوں ہی دلچسپ ہیں. دونوں ہی کمال لکھے ہیں ابن صفی نے۔

3۔ آپ کس بنیاد پر ابن صفی کو اردو جاسوسی ادب میں سب سے بڑا نام مانتے ہیں؟ کیا ابن صفی کو صرف جاسوسی ادب کا مصنف کہنا ان کی ادبی حیثیت کو محدود کرنا ہے؟

جواب۔ اگر آپ کے پاس دلیلیں ہوں تو ابن صفی کو اردو کے جاسوسی ادب کا بڑا نام سمجھنے کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں لیکن میرے خیال سے ناکامی آپ کے ہاتھ آئے گی۔

4- ابن صفی نے اپنے دور میں نوجوان نسل میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔۔ آج نوجوانوں میں یہ شوق پیدا کرنے اور ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کو نوجوانوں تک پہچانے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟؟

جواب۔ ابن صفی کے ناولوں کی آڈیو بک بنا کر نوجوانوں کو ان کی طرف راغب کیا جاسکتا ہے۔

5- آپ کے خیال سے ابن صفی کے جاسوسی ناول قارئین کو حقیقت سے دور تخیلاتی دنیا میں لے جاتے ہیں یا حقیقت پسند بناتے ہیں؟ کیا ان میں کوئی سماجی اور اخلاقی پیغام بھی موجود ہے؟

جواب۔ ابن صفی کے ناول تخیلاتی دنیامیں ضرور لے جاتے ہیں لیکن اس دنیامیں ہمارے اپنے عصر کے مسائل اور ہمارے اپنے سماج سے واقف کراتے ہوئے ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کراتے ہیں۔

6۔ اکثر اہلِ علم کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان ابن صفی کے ناول پڑھ کر سیکھی۔ آپ کے خیال میں ابن صفی کی تحریروں میں ایسی کون سی خصوصیات تھیں جو قاری کو زبان سکھادیتی تھیں؟

جواب۔ ابن صفی کی تحریروں کا تجسس، روانی اور باندھ رکھنے کا وصف لوگوں کو ابن صفی سے جوڑ لینے کے لیے کافی ہیں۔

7-ابن صفی کے ناولوں کی ایک اہم خوبی ان کی بہترین کردار نگاری مانی جاتی ہے ان کرداروں میں کون سی خاص بات تھی جو آج بھی قارئین کے ذہنوں میں تروتازہ ہیں؟

جواب۔ ابن صفی کے کردار نقلی نہیں بلکہ ہماری دنیا کے گوشت پوست کر کردار لگتے ہیں. یہی وجہ ہے ان کو پڑھنے والی آپس میں یوں بات کرتے ہیں جیسے وہ ان کرداروں سے ملے ہوں۔

8-آپ کی رائے میں ابن صفی کا بہترین مثبت کردار (عمران فریدی کے علاوہ) اور بہترین منفی کردار کون سا اور کیوں؟؟

جواب۔ مثبت کرداروں میں حمید اور جولیانا جبکہ منفی کرداروں میں سنگ ہی اور تھریسیا سب ابن صفی ان کرداروں کا پینٹ کرنا ہے۔

9-ابن صفی کے قارئین میں کئی نسلیں شامل ہیں۔ ان ناولوں میں ایسا کیا ہے جو انہیں آج کے ماحول پر منطبق کرتی ہے؟

جواب۔ جی ہاں ابن صفی نے کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے . ان کے ناول آج دور سے بھی مطابقت رکھتے ہیں کہ ان میں آج کے دور کے مسائل سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں۔

10۔ کیا ابن صفی کو اردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا عوامی ادیب قرار دیا جاسکتا ہے؟

جواب۔ اس سوال کی منطق سمجھ میں نہیں آئی. بیشک وہ جاسوسی ناولوں کی ضمن میں اردو کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ادیب ہیں۔

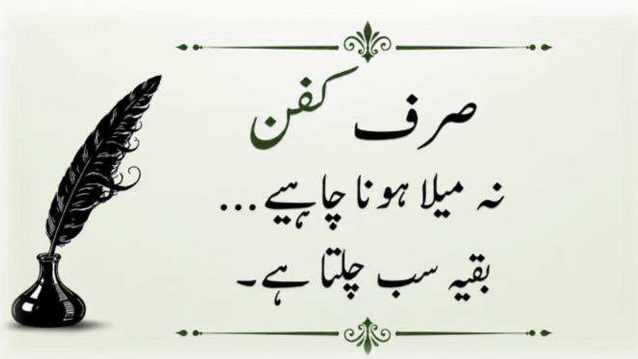

محمد عزم الحق شاہ کا تعلق فیصل آباد (پاکستان سے ہے۔ گزشتہ 8 سال سے شعبہ تدریس سے وابستہ ہیں اور انھوں نے اپنا ایم فل کا مقالہ ابن صفی کے کرداروں کا تحقیقی جائزہ پر لکھا تھا۔

1۔ آپ کا ابن صفی سے پہلا تعارف کیسے ہوا؟ اس وقت پڑھنے میں اور آج ابن صفی کے مطالعہ میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے۔

جواب۔ عمران سیریز سے میرا پہلا تعارف مظہر کلیم ایم اے کے ناولوں سے ہوا تھا۔ وہ پڑھتے ہوئے ایک دن میرے ماموں زاد بھائی نے بتایا کہ عمران سیریز کے اصل خالق تو ابن صفی ہیں۔ پہلا ناول شاید آہنی دروازہ تھا جو پڑھنے کا اتفاق ہوا اور کم عمری، ناتجربہ کاری کے باوجود واضح فرق محسوس ہوا۔ پھر ابن صفی کے ناولوں کی ایسی چاٹ لگی کہ کوئی اور نہ بھایا۔ پھر وہی پڑھتے ہوئے بڑا ہوا تو خیال آیا کہ اس پہ تو بہت سا ادبی کام ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے ایم فل کے مقالے کا عنوان ابن صفی کے کرداروں پہ رکھا۔
آج ابن صفی کے ناول پڑھنے میں زیادہ لطف دیتے ہیں کیوں کہ پہلے جب کم عمری میں پڑھتے تھے تو بہت سی باتیں سر کے اوپر سے گزر جاتی تھیں لیکن آج پڑھیں تو ابن صفی کا پیغام زیادہ واضح سمجھ آتا ہے۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ ابن صفی اپنے زمانے سے بہت آگے کے مصنف تھے۔

2۔ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب۔ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز دونوں ابن صفی کے ہی قلم سے نکلیں مگر ان کا مزاج اور ذائقہ بالکل الگ ہے۔ جاسوسی دنیا سنجیدہ، باوقار اور اصول پسند دنیا ہے جس کا مرکز کرنل فریدی ہے۔ یہاں انصاف، قانون اور منطق کی حکمرانی ہے۔ پلاٹ گہرے، پیچیدہ اور نفسیاتی ہوتے ہیں۔ مزاح موجود ہے مگر کیپٹن حمید کے ذریعے نپا تُلا اور شائستہ۔ یہ سیریز قاری کو دماغ لڑانے اور اخلاقی کشمکش میں الجھانے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں عمران سیریز سراسر بے فکری، مزاح اور الٹ پلٹ کا کھیل ہے۔ یہاں علی عمران کا کردار ہی قانون ہے۔ وہ بظاہر بے وقوف، لاابالی اور سادہ نظر آتا ہے مگر اس کی بے وقوفی ہی سب سے بڑی چال ہوتی ہے۔ اس سیریز میں پلاٹ تیزی سے بدلتے ہیں۔ سائنس فکشن اور ناممکن کارنامے زیادہ ہیں اور مزاح ہر دوسرے جملے میں ٹپکتا ہے۔ مختصر یہ کہ جاسوسی دنیا دماغ کو سنجیدگی سے چیلنج کرتی ہے۔ جب کہ عمران سیریز اسی چیلنج کو ہنسی ہنسی میں حل کروا دیتی ہے۔ ایک اصولوں کی جنگ ہے تو دوسری اصولوں کو توڑ کر نیا اصول بنانے کا فن۔ کسی اور مصنف کے ہاں آپ کو ایسا ادبی تنوع نظر نہیں آئے گا۔

3۔ آپ کس بنیاد پر ابن صفی کو اردو جاسوسی ادب میں سب سے بڑا نام مانتے ہیں؟ کیا ابن صفی کو صرف جاسوسی ادب کا مصنف کہنا ان کی ادبی حیثیت کو محدود کرنا ہے؟

جواب۔ میرے نزدیک ابن صفی کو اردو جاسوسی ادب کا سب سے بڑا نام ماننے کی بنیاد ان کی تین تاریخی خدمات ہیں۔ پہلی یہ کہ انہوں نے اردو میں جاسوسی ادب کی صنف باقاعدہ ایجاد کی۔ ان سے پہلے جاسوسی کہانی کا تصور ترجموں تک محدود تھا۔ ابن صفی نے اسے خالص دیسی کردار، ماحول اور مزاج دیا۔ عمران اور فریدی جیسے کردار آج بھی کاپی ہوتے ہیں۔ دوسری یہ کہ انہوں نے جاسوسی کو صرف جرم و سزا کی کہانی نہیں رہنے دیا۔ انہوں نے اس میں طنز، مزاح، نفسیات، سائنس فکشن، اور فلسفے کو ایسے ملایا کہ ایک نئی ادبی ہائبرڈ صنف بن گئی۔ تیسری ان کی مقبولیت اور اثر اندازی۔ 1950 سے آج تک کئی نسلیں ان کے ناولوں پر پلی ہیں اور اردو کے کئی بڑے لکھاری کھلے دل سے مانتے ہیں کہ انہوں نے لکھنا ابن صفی کو پڑھ کر سیکھا۔ بعد میں کئی ایسے مصنفین آئے جنہوں نے ابن صفی کو دیکھتے ہوئے اپنے کردار بنا کر لکھا۔ ان کے سرخیل ابن صفی کی کہلائیں گے۔

اور ہاں ابن صفی کو صرف " جاسوسی ادب کا مصنف " کہنا ان کی ادبی حیثیت کو یقیناً محدود کرنا ہے۔ وہ صرف جاسوسی نہیں لکھ رہے تھے وہ زبان کا معمار تھے۔ ان کے ہاں پلاٹ سے زیادہ کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور سماجی طنز ملتا ہے۔ ان کے ناولز میں اس وقت کے عالمی سیاسی حالات، انسانی نفسیات، اور اخلاقی کشمکش پر ایسی گہری گرفت ہے جو خالص ادب کا خاصہ ہوتی ہے۔ عمران کی بے وقوفانہ حرکتیں دراصل سماج پر طنز ہے۔ فریدی کی سنجیدگی دراصل اصول پسندی کا استعارہ ہے۔ ان کی نثر میں شاعری جیسی موسیقیت اور ڈرامے جیسا تاثر ہے۔ اس لیے وہ جاسوسی ادب کے مصنف ضرور تھے مگر اصل میں وہ ایک مکمل ادیب تھے جس نے جاسوسی کو ادب کے درجے تک پہنچایا۔

4۔ ابن صفی نے اپنے دور میں نوجوان نسل میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔۔ آج نوجوانوں میں یہ شوق پیدا کرنے اور ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کو نوجوانوں تک پہچانے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے ؟؟

جواب۔ اپنے زمانے میں ابن صفی نے نوجوانوں کو کہانی سنانے کے نشے میں مبتلا کر کے مطالعے کا عادی بنایا تھا۔ آج کا نوجوان کتاب سے دور ہے لیکن اسکرین کے قریب ہے۔ میڈیم بدلیں لیکن پیغام وہی رکھیں۔ یہ ایک ایسا ذریعہ ہے کہ آج کے نوجوان تک ہم زیادہ مؤثر انداز میں ابن صفی کا پیغام پہنچا سکتے ہیں۔ اس کی موجودہ شکل ویب سیریز ہو سکتی ہے، فلم ہو سکتی ہے۔ جو بھی ہو اصل مقصد ابن صفی کا پیغام پہنچانا ہے جو ان ذرائع کو استعمال میں لاتے ہوئے پہنچایا جا سکتا ہے۔

5۔ آپ کے خیال سے ابن صفی کے جاسوسی ناول قارئین کو حقیقت سے دور تخیلاتی دنیا میں لے جاتے ہیں یا حقیقت پسند بناتے ہیں؟ کیا ان میں کوئی سماجی اور اخلاقی پیغام بھی موجود ہے ؟

جواب۔ ابن صفی کے ناول قاری کو حقیقت سے دور نہیں کرتے بلکہ تخیل کی دنیا میں لے جا کر حقیقت کو سمجھنے اور اس کا سامنا کرنے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں بین الاقوامی سازشیں اور ناممکن مشن تخیل کا حصہ ضرور ہیں مگر ان کی بنیاد طاقت کے غلط استعمال، لالچ اور دھوکے جیسی حقیقی برائیوں پر ہے۔ پھر عمران و فریدی جیسے کردار سپر ہیرو نہیں بلکہ غلطیاں کرنے والے انسان ہیں جو اپنی غلطیوں سے سبق حاصل کرتے ہیں اور دماغ، ہمت اور صبر سے لڑتے ہیں۔ یہ قاری کو عملی اور حقیقت پسند بناتا ہے۔ ساتھ ہی ان ناولوں میں انصاف پر سمجھوتہ نہ کرنا، دوستی و وفاداری، وطن پرستی، انسانیت کی برتری اور عقل کو طاقت پر فوقیت جیسے سماجی و اخلاقی پیغامات کہانی کے واقعات میں اس طرح گُندھے ہوئے ہیں کہ وعظ کیے بغیر قاری کے ذہن میں بیٹھ جاتے ہیں۔ یوں ابن صفی تخیل کے ذریعے قاری کو سونے نہیں دیتے بلکہ جاگنے اور دنیا کا مقابلہ اپنے اصولوں اور مزاح کے ساتھ کرنے کا ہنر دیتے ہیں۔

6۔ اکثر اہلِ علم کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان ابن صفی کے ناول پڑھ کر سیکھی۔ آپ کے خیال میں ابن صفی کی تحریروں میں ایسی کون سی خصوصیات تھیں جو قاری کو زبان سکھا دیتی تھیں؟

جواب۔ اہلِ علم کے یہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ابن صفی کی تحریر صرف کہانی نہیں بلکہ زبان کا کلاس روم بھی تھی۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مشکل الفاظ کو کہانی کے بہاؤ میں اس طرح بُنتے تھے کہ قاری کو لغت کھولنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ سیاق وسباق سے ہی لفظ کا مطلب اور اس کا مزاج سمجھ آ جاتا تھا۔ دوسرا، ان کے مکالمے بول چال کے قریب مگر نپی تلی اردو میں ہوتے تھے۔ عمران، فریدی اور حمید کی نوک جھونک میں محاورے، روزمرہ اور فقرے اس قدر رواں تھے کہ قاری غیر محسوس طریقے سے انہیں اپنا لیتا تھا۔ تیسرا وہ فارسی، عربی اور انگریزی کے الفاظ کو اردو میں ایسے گھولتے تھے کہ زبان بوجھل نہیں لگتی تھی بلکہ ایک نیا ذائقہ پیدا ہوتا تھا جس سے قاری کا ذخیرۂ الفاظ خود بخود بڑھتا تھا۔ اور سب سے اہم بات، ان کی تحریر میں ایک تال، ایک موسیقیت تھی۔ جملے مختصر، برجستہ اور جاندار ہوتے تھے۔ جو پڑھنے والے کے ذہن میں چپک جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول ختم ہونے تک قاری نہ صرف جاسوسی سے لطف اٹھا چکا ہوتا تھا بلکہ انجانے میں اردو کا لہجہ، بناوٹ اور چاشنی بھی سیکھ چکا ہوتا تھا۔

7۔ ابن صفی کے ناولوں کی ایک اہم خوبی ان کی بہترین کردار نگاری مانی جاتی ہے ان کرداروں میں کون سی خاص بات تھی جو آج بھی قارئین کے ذہنوں میں تر وتازہ ہیں؟

جواب۔ ابن صفی کے کردار حقیقت سے قریب تر ہیں۔ ان میں کوئی ماورائی طاقتیں نہیں ہیں۔ وہ عام لوگوں جیسے ہیں۔ اسی لیے لوگ ان کے ساتھ خود کو جوڑ پاتے ہیں۔ عمران، فریدی، حمید، صفدر یہ ایسے کردار ہیں کہ کوئی ان کو پڑھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کوئی سپر پاور زر رکھتے ہیں۔ وہ عام لوگوں کی طرح ہیں۔ ان میں جذبات ہیں، وہ زخمی ہوتے ہیں، وہ گرتے ہیں اور پھر اپنے آپ کو اٹھاتے ہیں، مشکلات سے گزرتے ہیں۔ یہ تمام لوازمات ابن صفی کے کرداروں کو لاجواب بناتے ہیں۔

8۔ آپ کی رائے میں ابن صفی کا بہترین مثبت کردار (عمران فریدی کے علاوہ) اور بہترین منفی کردار کون سا اور کیوں؟

جواب۔ جاسوسی دنیا کے مثبت کرداروں میں مجھے قاسم کا کردار سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ ابن صفی نے جس طرح نفسیاتی طور پہ اس کردار کو بنایا ہے وہ کردار سازی میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی کئی پرتیں ہیں۔ وہ معصوم بھی ہے اور جنسی طور پہ الجھا ہوا ہے۔ وہ اپنی ذہنی رو کے ہاتھوں مجبور ہو کر کچھ بھی کر گزرتا ہے۔ پھر اس کے دل میں فریدی کا احترام اور خوف، حمید کے لیے دوستی اور رقابت جیسے جذبات اسے ایک مکمل کردار بناتے ہیں۔

جاسوسی دنیا کے منفی کرداروں میں ڈاکٹر ڈریڈ پسند آیا۔ ڈاکٹر ڈریڈ ایک ایسا مجرم ہے جو علی الاعلان جرم کرتا ہے۔ اس کی منصوبہ بندی کی داد دینی پڑتی ہے اور وہ ایک لحاظ سے پولیس کو چیلنج کرتا ہے کہ ہمت ہے تو پکڑ کر دکھاؤ۔ اپنے آپ میں ایک شاندار کردار ہے۔

عمران سیریز کے مثبت کرداروں میں مجھے روشی اور صفدر کے کردار پسند آئے۔ روشی نے جس طرح عمران کا ساتھ دیا، عمران کی خاطر خود کو بدلا اور اس کے راز کی حفاظت کی وہ ایک شاندار ساتھی ثابت ہوتی ہے۔ صفدر ایک ایسا کردار ہے جسے عمران سے صرف دوستی والا رشتہ ہی نہیں بلکہ وہ عمران کو اپنا استاد مانتا ہے۔ ایک وفادار ساتھی ہے۔

منفی کرداروں میں سنگ ہی کے مقابلے میں شاید ہی کوئی آ سکے۔ اس کی عیاری، پھرتی، ذہانت اور سب سے بڑھ عمران کی قدر۔

9۔ ابن صفی کے قارئین میں کئی نسلیں شامل ہیں۔ ان ناولوں میں ایسا کیا ہے جو انہیں آج کے ماحول پر منطبق کرتی ہے؟

جواب۔ ابن صفی کے ناول آج بھی اس لیے متعلقہ ہیں کیونکہ ان کے کردار جیسے عمران اور فریدی محض ہیرو نہیں بلکہ اپنی مزاح، بے فکری اور انسانی کمزوریوں کے ساتھ زندہ لگتے ہیں۔ ان کی تحریر میں سسپنس اور غیر متوقع موڑ ہر باب کے آخر میں قاری کو باندھے رکھتے ہیں جو آج کی ویب سیریز سے کم نہیں ہے۔ ساتھ ہی ہلکے پھلکے مکالموں اور سنجیدہ موضوعات کا ایسا توازن ہے جو تھرلر کو بوجھل نہیں ہونے دیتا اور ان کہانیوں میں انصاف، دوستی، وفا اور انسانیت پر زور ہے جو مفادات کے اس دور میں تازگی کا احساس دیتا ہے۔ جب کہ سادہ مگر باوقار اردو زبان اور بین الاقوامی سازشوں، سائنس فکشن اور نفسیاتی کھیل جیسے وقت سے ماورا موضوعات انہیں ہر نسل کے لیے تازہ بنا دیتے ہیں۔
یک لفظی جواب دینا ہو تو وہ ہے " آفاقیت"

بڑے ادیب کے لکھے میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ وہ اپنے زمانے سے آگے ہوتا ہے۔ اس کا شعور بہت بلند ہوتا ہے۔ چاہے اس کا نام انگریزی کا شیکسپیئر ہو، فارسی کا شیخ سعدی ہو یا اردو کے مرزا اسد اللہ خان غالب اور علامہ محمد اقبال ہوں، ان میں جو چیز مشترک نظر آتی ہے وہ آفاقیت ہے۔ ان کی باتیں صدیوں بعد بھی تازہ محسوس ہوتی ہیں۔ یہی چیز ابن صفی کے ناولوں میں بھی موجود ہے۔ ابن صفی کے ناول اپنے زمانے میں تو جدید تھے ہی آج کا زمانہ بھی ابھی وہاں نہیں پہنچ سکا۔ فلموں میں تو سائنس فکشن کے ذریعے انسان دوسرے سیاروں تک پہنچ گیا لیکن حقیقت میں ابھی تیاری جاری ہے۔ ابن صفی نے اپنے زمانے میں دوسرے سیاروں کا ذکر کیا تھا۔ فے گراز کو آپ جدید اسپیس شپ سمجھ لیں۔ اس طرح کی اور بھی بہت ساری مثالیں ہیں جو ابن صفی کو ایک آفاقی مقام تک لے جاتی ہیں۔ ابن صفی آج کے دور میں ہوتے تو شاید پہلے مصنف ہوتے جو ملٹی ورس پہ لکھتے۔

10۔ کیا ابن صفی کو اردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا عوامی ادیب قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب۔ تھوڑا سا اختلاف ہے لیکن ایک بڑی تعداد کو ابن صفی نے اپنی تحریروں کے ذریعے متاثر کیا ہے۔ اپنے زمانے میں تو ابن صفی کی شہرت کا کوئی جوڑ نہیں تھا جب ابن صفی کی عدم موجودگی میں کئی جعلی مصنفین نے نام استعمال کر کے لکھا کیوں کہ اس وقت کچھ اور بکتا ہی نہیں تھا۔ پھر ڈیڑھ متوالے کی اشاعت کے ساتھ ہی اس کا ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ابن صفی اپنے زمانے کے سب سے بڑے مصنف تھے۔ رہی بات آج کے زمانے کی تو آج چوں کہ ڈیجیٹل دور ہے تو پڑھنا پڑھانا ویسے تو نہیں رہا البتہ ابن صفی کے ناولوں کی مقبولیت اور معیار میں کوئی برابری نہیں کر سکا۔ اب اگر ان کے ناولوں کو فلمی صورت میں ڈھالا جائے تو مجھے یقین ہے کہ یہ بھی اپنے آپ میں ایک الگ دنیا ہو گی جو لوگوں کو پسند آئے گی۔

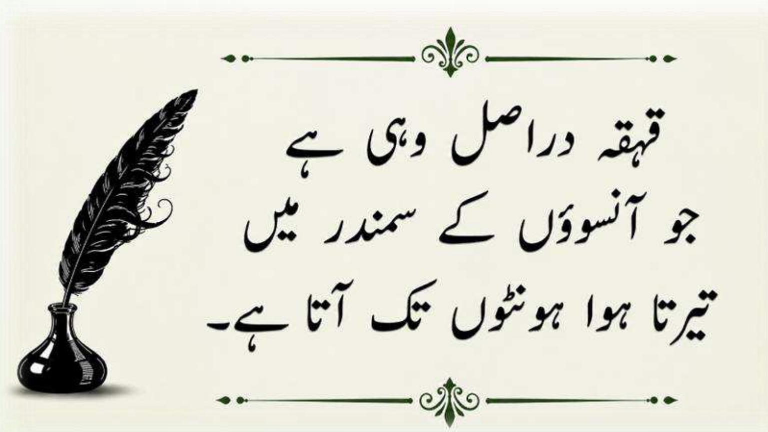

فراز علی حیدری کا تعلق کراچی پاکستان سے ہے وہ ایک کمپیوٹر ٹیچر اور ای بزنس اونر ہیں۔ سوشل میڈیا پر اور ادبی پروگرام میں اپنی تحریروں سے پہچان بنا چکے ہیں اور اپنے تخلیقی سفر کا کریڈٹ ابن صفی اور اشتیاق احمد کو دیتے جن کی تصنیفات پڑھ کر انھوں نے لکھنا سیکھا۔

1۔ آپ کا ابن صفی سے پہلا تعارف کیسے ہوا؟ اس وقت پڑھنے میں اور آج ابن صفی کے مطالعہ میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے ؟

جواب۔ ابن صفی صاحب سے پہلا تعارف غالباً پہلی جماعت میں ہوا تھا جب اقبال لائبریری میں اشتیاق احمد کے ناول ڈھونڈتے ہوئے مجھے ع اور ج والے ناول ملے تھے۔ میں نے پہلی بار جاسوسی دنیا کا ناول " چاندنی کا دھواں " پڑھا تھا۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے عمران سیریز اور جاسوسی دنیا کے ناول پڑھے۔ پہلے مطالعہ کرتے ہوئے عمر اور شعور کی سطح کے مطابق صرف لطف آتا تھا۔ اب پڑھتے ہوئے مختلف انداز میں بیان کی گئی نفسیاتی پیچیدگیوں سے متعلق علم ہوتا ہے۔

2۔ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب۔ جاسوسی دنیا ایک خالصتاً جاسوسی، مہم جوئی اور سنجیدہ واقعات پر مبنی سیریز ہے۔ جس کی سنجیدگی کو اثر کو کم کرنے کے لیے حمید اور قاسم جیسے کردار وضع کیے گئے۔ نفسیاتی و جرائم سے متعلق اصطلاحات کو جاسوسی دنیا میں قدرے سنجیدہ اور پیچیدہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جبکہ عمران سیریز میں مزاح، طنزیہ اور اتفاقات کے تحت واقعات بیان کرتے ہوئے قاری کا ذہن کافی ہلکا رہتا ہے۔ نفسیاتی اور جرائم کی اصطلاحات عام فہم انداز میں بیان کی گئی ہیں۔

3۔ آپ کس بنیاد پر ابن صفی کو اردو جاسوسی ادب میں سب سے بڑا نام مانتے ہیں؟ کیا ابن صفی کو صرف جاسوسی ادب کا مصنف کہنا ان کی ادبی حیثیت کو محدود کرنا ہے؟

جواب۔ عالیہ کی دی ہوئی چھالیہ کھاتے ہوئے ادبی پیمانے بنانے والے نام نہاد نقادوں کے پیش نظر میں ابن صفی کو جاسوسی ہی نہیں ادب کی تمام تر اصناف کا قد آور ادیب سمجھتا ہوں۔

4۔ ابن صفی نے اپنے دور میں نوجوان نسل میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔۔ آج نوجوانوں میں یہ شوق پیدا کرنے اور ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کو نوجوانوں تک پہچانے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے ؟؟

بجواب۔ الکل ابن صفی صاحب نے اپنے دور میں ہر عمر کے قاری میں کتب بینی کا شوق پیدا کیا۔ آج ان کے ناولوں کی کہانیوں اور مرکزی خیالوں کو لے کر ان کا کریڈٹ ابن صفی صاحب کو دے کر مختلف فلمیں، شارٹ فلمیں اور ویب سیریز بنانی چاہیے۔

5۔ آپ کے خیال سے ابن صفی کے جاسوسی ناول قارئین کو حقیقت سے دور تخیلاتی دنیا میں لے جاتے ہیں یا حقیقت پسند بناتے ہیں ؟ کیا ان میں کوئی سماجی اور اخلاقی پیغام بھی موجود ہے ؟

جواب۔ ابن صفی صاحب کے ناول بالکل حقیقی انداز میں دنیا کو سمجھنے پر کھنے کا شعور دیتے ہیں۔ ان میں جا بجا اخلاقی پیغامات موجود ہیں۔ ایک عام مثال جاپان کا فتنہ ناول کا کردار نادر ہے۔ یا پھر روشی جیسا اہم نسوانی کردار۔ مزید تذکرہ کریں تو جاسوسی دنیا کا پہلا ناول دلیر مجرم ہی ان کے ناولوں میں چھپے اخلاقی و اصلاحی پیغام کی ایک بہت بڑی مثال ہے۔

6۔ اکثر اہلِ علم کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان ابن صفی کے ناول پڑھ کر سیکھی۔ آپ کے خیال میں ابن صفی کی تحریروں میں ایسی کون سی خصوصیات تھیں جو قاری کو زبان سکھا دیتی تھیں ؟

جواب۔ ابن صفی صاحب کے ناول بالکل عام فہم ہوتے تھے۔ ان میں استعمال ہونے والی زبان، واقعات، مقامات عام فہم اور عوامی ہوتے تھے۔ انہیں پڑھنے والا ہر قاری ان کے ناولوں میں بیان کی گئی تفصیلات کو با آسانی امیجن Imagine کر سکتا تھا۔

7۔ ابن صفی کے ناولوں کی ایک اہم خوبی ان کی بہترین کردار نگاری مانی جاتی ہے ان کرداروں میں کون سی خاص بات تھی جو آج بھی قارئین کے ذہنوں میں ترو تازہ ہیں ؟

جواب۔ ابن صفی صاحب کے مرکزی کردار، سائیڈ کردار اور منفی کردار کی مختلف خوبیاں یا خامیاں انہیں ہر دلعزیز بناتی تھیں مزید یہ کہ مرکزی کرداروں کو ایک دم سپر ہیرو بنانے کے بجائے ان میں بتدریج بہتری لائی گئی۔ یہ عمل بھی سونے پر سہاگا ثابت ہوا۔

8۔ آپ کی رائے میں ابن صفی کا بہترین مثبت کردار (عمران فریدی کے علاوہ) اور بہترین منفی کردار کون سا اور کیوں ؟؟

جواب۔ بہترین مثبت کردار روشی۔۔۔ کیونکہ روشی جس مایا جال میں پھنس چکی تھی، وہاں وفا بھروسا یا پیسوں سے بے رغبتی ایک ناممکن سی بات ہوتی ہے۔ مگر روشی عمران سے ایک ہی ملاقات میں بدل گئی اور ایکسٹو ہونے کا راز جن چند لوگوں کے علم میں تھا ان میں ایک روشی بھی تھی۔

بہترین منفی کردار تھریسیا۔۔۔

سب سے خاص تو وہ تھی سپر وومین۔۔۔ عمران کی فین۔۔۔ دوسرا یہ کہ صنف نازک ہو کر بھی اس نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے تھے یہاں تک کہ بھتیجے کے پیارے چچا سنگ ہی کو بھی ناگن ڈانس کروا دیا تھا۔ اور اس کے حلق میں لگا اے آئی اسپیکر، جس سے کائنات بھر کی عجیب اور ہولناک آوازیں نشر ہوتی تھیں۔

9۔ ابن صفی کے قارئین میں کئی نسلیں شامل ہیں۔ ان ناولوں میں ایسا کیا ہے جو انہیں آج کے ماحول پر منطبق کرتی ہے ؟

جواب۔ اس کا تقریباً جواب پہلے جیسا ہی ہے۔ ان کے ناول عام فہم اور ہر انسان کے امیجینشن میں آجانے والے ہیں۔ ہر قاری ان واقعات کو اپنے آس پاس ہوتا دیکھ سکتا ہے یا تصور کر سکتا ہے۔ عمران فریدی حمید سپر ہیرو کی جگہ عام انسان ہیں کامیاب ہوتے، ناکام ہوتے اور غلطیاں بھی کرتے ہیں۔

10۔ کیا ابن صفی کو اردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا عوامی ادیب قرار دیا جاسکتا ہے؟

جواب۔ جس مصنف کے ناول کا ایک ایڈیشن ہفتے میں ختم ہو جائے۔ جس مصنف کے انتقال کے چالیس پینتالیس سال بعد بھی اس کے ناولوں کے ایڈیشن مسلسل چھپ رہے ہوں اور فروخت ہو رہے ہوں۔ جس مصنف کے ناولوں اور شخصیات پر اصلی مقالے اور درجنوں کتابیں لکھی جائیں۔۔۔ اسے مقبول ترین مصنف نہ کہنا تو ناانصافی ہے۔

فائزہ احمد کا تعلق ناگپور سے ہے اردو ادب میں ماسٹر کیا ہے۔ کہانیاں اور فلمی تبصرے لکھتی ہیں۔ ابن صفی کے مداحوں میں سے ہیں ۔

۔ آپ کا ابن صفی سے پہلا تعارف کیسے ہوا؟ اس وقت پڑھنے میں اور آج ابن صفی کے مطالعہ میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے؟

جواب۔ میرا ابن صفی سے پہلا تعارف تقریباً تیرہ سال کی عمر میں ہوا۔ فریدی سیریز سے میں نے شروعات کی تھی۔ اس وقت اور آج میں یہ فرق ہے کہ پہلے کتابوں میں پڑھا کرتے تھے۔ اور بہت دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔ اور تفریح کا کوئی دوسرا ذیعہ نہیں تھا۔ آج فرق یہ ہے کہ موبائیل پر پڑھتے ہیں۔ اور آج بھی دلچسپی ہے۔ لیکن اب تفریح کے اور بھی بہت سے ذرائع آچکے ہیں۔ اس لیے پڑھتے تو ہیں۔ لیکن اب پہلے کی طرح اتنا وقت نہیں ملتا۔

2۔ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب۔ جاسوسی دنیا فریدی اور حمید کے گرد گھومتی ہے۔ جبکہ عمران سیریز عمران کے کارناموں پر مشتمل ہے۔ اور میرے حساب سے تو دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں سیریز کے کردار گو مختلف طبیعتوں کے ہیں۔ لیکن مقصد صرف ایک ہی ہے قانون کی بالادستی۔

4-ابن صفی نے اپنے دور میں نوجوان نسل میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔۔ آج نوجوانوں میں یہ شوق پیدا کرنے اور ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کو نوجوانوں تک پہنچانے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟؟

جواب۔ آج کے نوجوانوں میں تک اگر ابن صفی کے جاسوسی ناولز پہنچانے ہیں تو اس کا ایک بہترین ذریعہ ہے انٹرنیٹ۔ آپ انٹرنیٹ سے اس معاملے میں استفادہ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ آج کے نوجوان کی تفریح کا ذریعہ بہت حد تک انٹرنیٹ ہی ہے۔

5-آپ کے خیال سے ابن صفی کے جاسوسی ناول قارئین کو حقیقت سے دور تخیلاتی دنیا میں لے جاتے ہیں یا حقیقت پسند بناتے ہیں؟ کیا ان میں کوئی سماجی اور اخلاقی پیغام بھی موجود ہے؟

جواب۔ ابن صفی کے ناولز قاری کو حقیقت پسند بناتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان ناولز کو پڑھنے والا کبھی بھی خیالات کی دنیا میں نہیں رہتا۔ وہ حقیقت اور تخیل میں فرق بخوبی سمجھتا ہے۔ قانون کی بالا دستی اور تمام طرح کی برائیوں کا خاتمہ یہ ہی ان ناولز کا سماجی اور اخلاقی پیغام ہے۔

6۔ اکثر اہلِ علم کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان ابن صفی کے ناول پڑھ کر سیکھی۔ آپ کے خیال میں ابن صفی کی تحریروں میں ایسی کون سی خصوصیات تھیں جو قاری کو زبان سکھا دیتی تھیں؟

جواب۔ ابن صفی کی تحریروں میں اردو زبان سیکھنے والوں کے لیے جو سب سے بڑی خوبی تھی وہ تھی خالص اردو کا استعمال۔ ان کے ناولز میں آپ انگریزی یا کسی بھی دوسری زبان کے الفاظ کم ہی پائیں گے۔ وہ اردو کے متبادل انگلش الفاظ صرف تب استعمال کرتے تھے۔ جب یہ ضروری ہو۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں سے اہل علم نے اردو سیکھی۔

7-ابن صفی کے ناولوں کی ایک اہم خوبی ان کی بہترین کردار نگاری مانی جاتی ہے ان کرداروں میں کون سی خاص بات تھی جو آج بھی قارئین کے ذہنوں میں تر و تازہ ہیں؟

جواب۔ ابن صفی کے ناولوں کی ایک بڑی خوبی ان کی کردار نگاری بھی ہے۔ ان کا ہر کردار منفرد اور انوکھا ہوتا تھا۔ چاہے۔ وہ عمران سیریز کا علامہ دہشت ناک ہو یا فریدی سیریز کا قاسم۔ ہر کردار میں کچھ نیا اور انوکھا پن ہوتا تھا اور ساتھ ہی اس کردار کی ایک ایسی نفسیاتی گرہ بھی ہوتی تھی جو قارئین کو اپنے ساتھ باندھ لیتی تھی۔

8-آپ کی رائے میں ابن صفی کا بہترین مثبت کردار (عمران فریدی کے علاوہ) اور بہترین منفی کردار کون سا اور کیوں؟؟

جواب۔ میری رائے میں ابن صفی کا مثبت کردار جاسوسی دنیا سے نادر ہے۔ وہی نادر جو پہلے بہت گناہ گار ہوتا ہے۔ لیکن موقع ملنے پر نیکی کی راہ پر چل پڑتا ہے اور پھر لاکھ پریشانیوں کے باوجود بھی واپس کبھی پیچھے نہیں ہٹتا۔

اور منفی کردار عمران سیریز میں سے علامہ دہشت ناک ہے۔ کیونکہ اس کے برا بننے کے پیچھے بھی ایک نفسیاتی وجہ موجود ہے۔ اسی وجہ سے اس کردار سے آخر میں ہمدردی محسوس ہوتی ہے۔

9-ابن صفی کے قارئین میں کئی نسلیں شامل ہیں۔ ان ناولوں میں ایسا کیا ہے جو انہیں آج کے ماحول پر منطبق کرتی ہے؟

جواب۔ ابن صفی کے ناولز کئی نسلوں نے پڑھے ہیں۔ اور یہ ناول آج کے ماحول پر بھی منطبق آتے ہیں کیونکہ آج جو کچھ بھی دنیا میں ہو رہا ہے مثال کے طور پر وبا، جنگ، خون خرابہ، رشوت ستانی، طوائف الملوکی ان سب کے بارے میں ان ناولز میں بیان کیا گیا ہے

10۔ کیا ابن صفی کو اردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا عوامی ادیب قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب۔ جی ہاں دیا جا سکتا ہے اور بالکل دیا جانا چاہیئے۔ کیونکہ یہ ناول نہ صرف ہماری تفریح کا ذریعہ ہیں بلکہ اردو ادب کا ایک بیش بہا اور بیش قیمتی خزانہ بھی ہیں۔ ان ناولز سے نہ صرف پرانی کئی نسلوں نے فائدہ اٹھایا ہے بلکہ اب نئی نسل بھی ان سے فیض یاب ہو رہی ہے۔ اس لیے ابن صفی کو اردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ادیب قرار دینا چاہیئے۔

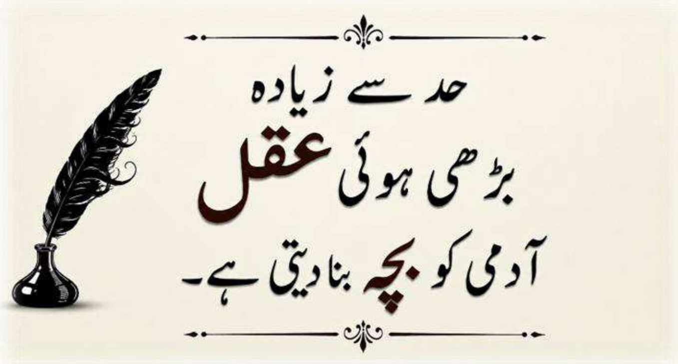

ایس ایم حسینی کا تعلق لکھنؤ سے ہے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ انہیں علم و ادب سے گہرا شغف ہے اور درجنوں تجزیاتی، تبصراتی اور تنقیدی مضامین لکھ چکے ہیں۔ انھوں نے افسانے، انشائیے اور نظمیں وغیرہ بھی لکھی ہیں۔ سفر ناموں پر مشتمل ایک کتاب "پکارتے ہیں راستے 2025 "ء منظر عام پر آچکی ہے

1۔ آپ کا ابن صفی سے پہلا تعارف کیسے ہوا؟ اس وقت پڑھنے میں اور آج ابن صفی کے مطالعہ میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے۔

جواب۔ میرا ابن صفی سے باقاعدہ تعارف 2017ء کے رمضان میں عمران سیریز کے ناول" خوشبو کا حملہ "کے ذریعے ہوا۔ اس سے پہلے تاریخی ناول پڑھتے تھے اور ابن صفی کے ناولوں سے کچھ اجنبیت سی محسوس ہوتی تھی، لیکن" خوشبو کا حملہ "نے یہ دیوار گرادی۔ پھر ایسا ہوا کہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ہر وقت ابن صفی ہی ذہن میں رہنے لگے۔ ابتدا میں ان کے ناولوں میں تجسس، مہم جوئی اور کہانی کا بہاؤ زیادہ متاثر کرتا تھا، لیکن آج دوبارہ پڑھتے ہیں تو ان کے ناولوں میں مکالمے، طنز و مزاح، کردار نگاری، انسانی نفسیات پر گرفت اور زبان و بیان کی خوبیوں پر زیادہ توجہ جاتی ہے۔ پہلے لطف صرف کہانی سے آتا تھا، اب اس کے فنی اور ادبی محاسن بھی واضح نظر آتے ہیں۔

2۔ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں۔

جواب۔ میرے نزدیک جاسوسی دنیا اور عمران سیریز دونوں کی اپنی الگ شناخت ہے۔ جاسوسی دنیا میں فریدی کی سنجیدگی، نظم و ضبط اور کلاسیکی جاسوسی عناصر نمایاں ہے، جب کہ عمران سیریز میں مزاح، شوخی، غیر متوقع صورتِ حال اور عمران کی انوکھی شخصیت زیادہ دلکش محسوس ہوتی ہے۔ چوں کہ میرا پہلا تعارف عمران سیریز سے ہوا تھا، اس لیے اس کا ذائقہ آج بھی ذہن میں زیادہ رچا بسا ہوا ہے، اگرچہ فریدی سیریز کی سنجیدگی اور وقار بھی اپنی مثال آپ ہے۔

3۔ آپ کس بنیاد پر ابن صفی کو اردو جاسوسی ادب میں سب سے بڑا نام مانتے ہیں؟ کیا ابن صفی کو صرف جاسوسی ادب کا مصنف کہنا ان کی ادبی حیثیت کو محدود کرنا ہے؟

جواب۔ ابن صفی نے اردو میں جاسوسی ادب کی بنیاد کو نہ صرف مستحکم کیا بلکہ اسے ایک ادبی وقار عطا کیا۔ انہوں نے تقریباً ڈھائی سو ناول لکھے، نیز اپنے خونِ جگر اور غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں سے نئی وسعت عطا کی۔ انہوں نے ناقابلِ فراموش کردار تخلیق کیے اور تجسس کے ساتھ طنز و مزاح، نفسیات، سماجی شعور اور فکری تربیت کو اپنے ناولوں کا حصہ بنایا۔ میرے خیال میں صرف جاسوسی ناول نگار کہنا ان کی ادبی حیثیت کو محدود کرنا ہوگا، کیوں کہ وہ بہترین مزاح نگار، شاعر اور صاحب اسلوب ادیب بھی تھے۔

4۔ ابن صفی نے اپنے دور میں نوجوان نسل میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔۔ آج نوجوانوں میں یہ شوق پیدا کرنے اور ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کو نوجوانوں تک پہچانے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟؟

جواب۔ آج کے دور میں سوشل میڈیا، آڈیو بکس، ای بکس، مختصر ویڈیوز اور ادبی مباحث کے ذریعے نوجوانوں تک ابن صفی کو پہنچایا جا سکتا ہے۔ اگر ان کے تخلیق کردہ کردار، دلچسپ واقعات اور مزاحیہ اقتباسات کو جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعے پیش کیا جائے تو نوجوان آسانی سے ان کی طرف راغب ہو سکتے ہیں۔ ابن صفی کی زبان آسان اور اسلوب دلکش ہے اور میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ایک بار قاری ابن صفی کو پڑھنا شروع کر دے تو پھر ان کے سحر سے نکلنا آسان نہیں۔

5۔ آپ کے خیال سے ابن صفی کے جاسوسی ناول قارئین کو حقیقت سے دور تخیلاتی دنیا میں لے جاتے ہیں یا حقیقت پسند بناتے ہیں؟ کیا ان میں کوئی سماجی اور اخلاقی پیغام بھی موجود ہے؟

جواب۔ ابن صفی کے ناول محض تفریح فراہم نہیں کرتے بلکہ قاری کی ذہنی اور فکری تربیت بھی کرتے ہیں۔ نیز حقیقت پسندی اور اخلاقی شعور کو بھی فروغ دیتے ہیں۔ ابن صفی کے ناولوں میں ایک مقصد اور پیغام موجود ہے، اس لیے انہیں صرف تفریحی ادب نہیں کہا جا سکتا۔

6۔ اکثر اہلِ علم کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان ابن صفی کے ناول پڑھ کر سیکھی۔ آپ کے خیال میں ابن صفی کی تحریروں میں ایسی کون سی خصوصیات تھیں جو قاری کو زبان سکھا دیتی تھیں؟

جواب۔ جی ہاں، اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اکثر اہل علم بلکہ ایک پوری نسل ہے جس نے ابن صفی کے ناول پڑھ کر اردو زبان سیکھی، اور بہت سے ایسے بھی ہیں جنہوں نے ابن صفی کو پڑھنے کے لیے اردو زبان سیکھی، دراصل ابن صفی کی ناولوں کی زبان نہایت سادہ، آسان، رواں، شستہ، اور عام فہم ہے۔ مکالمہ نگاری میں ان کا کوئی جواب نہیں، اور منظر نگاری تو ایسی مؤثر ہوتی ہے کہ قاری ناول کے ساتھ بہتا اور تصویر بناتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح غیر محسوس انداز میں نئے الفاظ، محاورات اور جملوں کی ساخت سے قاری کو واقفیت بھی ہو جاتی ہے۔ اور قارئین اپنی زبان دانی کا سہرا ابن صفی کے سر باندھتے ہیں۔

9۔ ابن صفی کے قارئین میں کئی نسلیں شامل ہیں۔ ان ناولوں میں ایسا کیا ہے جو انہیں آج کے ماحول پر منطبق کرتی ہے؟

جواب۔ ابن صفی نے انسانی فطرت، اقتدار کی خواہش، جرائم، اخلاقی کشمکش اور سماجی مسائل جیسے دائمی موضوعات کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ یہ مسائل آج بھی موجود ہیں اور آگے بھی رہیں گے، اس لیے ان کے ناول ہر دور کے قاری کو اپنے قریب محسوس ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ابن صفی کی تحریروں میں موجود مزاح، تجسس اور انسانی نفسیات کی عکاسی ان کے ناولوں کو زمانے کی قید سے آزاد کرتی ہے۔

10۔ کیا ابن صفی کو اردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا عوامی ادیب قرار دیا جاسکتا ہے؟

جواب۔ میرے خیال میں اگر عوامی مقبولیت، قارئین کی تعداد اور نسل در نسل اثرات کو معیار بنایا جائے تو ابن صفی یقیناً اردو کے بڑے عوامی ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے کردار آج بھی زندہ ہیں، ان کے ناول آج بھی شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور نئے قارئین مسلسل ان کے حلقۂ اثر میں شامل ہو رہے ہیں۔ کسی ادیب کی مقبولیت کا اس سے بڑا ثبوت شاید ہی کوئی اور ہو۔

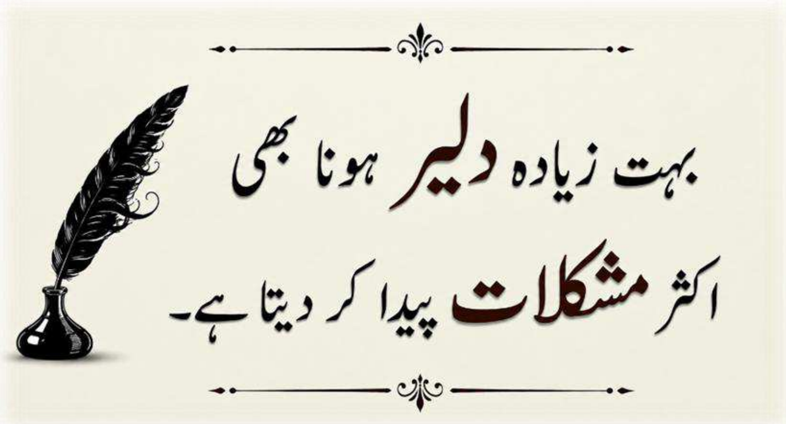

عنقاسدید کا تعلق بھوپال سے ہے۔۔اردو ادب اور ابن صفی سے گہرا تعلق رہا ہے

1۔ آپ کا ابن صفی سے تعارف کیسے ہوا اور عمر کے کس دور میں ہوا؟؟ اس وقت پڑھنے میں اور اب ابن صفی کو پڑھنے میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے

جواب۔پالنے میں ہوا تھا۔۔ابن صفی لوری سنا رہے تھے ہم سن رہے تھے۔یہ کیسا سوال ہوا کہ تعارف کیسے ہوا۔

ہم سبزی منڈی کدو خریدنے گئے تھے وہاں ایک آڑھت پر ملے تھے۔وہ ترکاریاں کاٹ کر جاسوس بنا رہے تھے وہاں تعارف ہوا۔

بلکہ یاد آیا ایک بار دفعہ ہم آبنائے ہرمز سے گزر رہے تھے ابن صفی کا جہاز وہاں اٹکا تھا۔امے وہ مصنف ہم قاری تو تعارف ہو گیا۔ہم کتاب خور وہ قلم کے دھنی۔ان کو ہم تک آنا ہی تھا ہم کو ان تک جانا ہی تھا۔ہم تو بچپن سے ہی پڑھ رہے بھیا۔

یہ سوچو ہم نے ابن صفی کے بعد جب ابن کھسی ابن کسی ابن لسی دیکھے ہوں گے ہمارے دل پر کیا گزری ہو گی۔کیسے کیسے عظیم کردار ان لسیوں ٹسیوں اور ناجائز ابنوں نے رول ڈالے۔مال مفت دل بے رحم بھی ہو تب بھی اتنا کون کرتا۔دال روٹی کی چلانی تھی تو کریانہ بنا لیتے۔کتاب میں نقب۔قلم کی چوری، لفظوں کی ہیرا پھیری، کرداروں کا فراڈ یہ کون کرتا۔بندہ پوچھے کہ کیوں لکھ رہے بس ردی بڑھا رہے۔غالب کے بعد کسی ٹالب کی کیا ضرورت۔امے اتنا شوق تھا تو اپنا لکھو۔خیر چھوڑو لمبا قصہ پھر کبھی سنائیں گے۔

تم فرق پوچھ رہے تو وہ بتا دیتے۔۔۔فرق محسوس ہوا۔اب نظر کمزور ہو گئی۔باقی ابن صفی تو ابن صفی پہ رہیں گے نا۔۔یہ تو ایسا ہی سوال ہوا کہ غالب کے پڑھنے کے بیس سال بعد غالب پھر کیسے لگے۔ارے ابن صفی عمر سے بس اتنا تعلق رکھتے ہیں کہ وہ اور گہرے اثرات چھوڑنے لگتے۔ان کی عادت، نشہ اور ساتھ مزید خطرناک ہو جاتا۔خود سوچو بازار سے پارک، گھر سے کالج، گراؤنڈ سے بینک کی لائن ہر جگہ ابن صفی کو انسان پڑھنے لگتا۔بڑے خطرناک ہیں بھئی۔لگ گیا تو نشہ تو چھوٹتا نہیں۔۔

2۔ابن صفی کی دونوں سیریز جاسوسی دنیا اور عمران میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں۔۔

جواب۔کاہے کا فرق میاں۔یہ کون سا بریانی اور پلاؤ کا مقابلہ۔ عقل سے دیکھو نیت صاف کرو دماغ کی بتی روشن کرو۔ قلم دیکھو، شاہکار نہیں۔

ہم صاحب قلم کے شیدائی ہوئے تو اس کے بعد وہ جو لکھتے رہے ہمیں بس اپنا لگتا سب ہی ن دونوں کا سادہ فرق سمجھو گے تو بتائے دیتا ہوں۔

عمران مٹھاس ہے اور فریدی نمک۔دونوں ضروری ہیں۔

کسی سے ہنڈیا بنتی کسی سے چائے ۔۔ایک دل کی دوا ایک دماغ کی ضرورت۔ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل ہیں۔دونوں کا رنگ جدا جدا مگر تاثیر ایک۔

ہمیں تو دونوں اندر سے یار لگتے۔آپس میں ملے ہوئے۔دوسروں کو مقابل لگتے ہمیں تو دونوں ظلم و جبر اور ناانصافی کے خلاف اکٹھے لڑتے نظر آتے۔

ہماری نظر ایسی ہے بھئی۔ تم غور سے دیکھو تو ایک ہی تصویر ہے بس انداز جدا۔ ایک ہی سکے کے دو رخ۔

3۔ آپ کس بنیاد پر ابن صفی کو اردو جاسوسی ادب میں سب سے بڑا نام مانتے ہیں؟ کیا ابن صفی کو صرف جاسوسی ادب کا مصنف کہنا ان کی ادبی حیثیت کو محدود کرنا ہے؟

جواب۔ کس بنیاد پر؟ امے یہ پوچھیے کہ کس کس بنیاد پر بڑا نہیں سمجھتے۔ ایک تو اردو پھر جاسوسی۔ تم ہی کہو ابن صفی کے علاوہ کوئی نام گزرا ہے۔

چلو مان لیتے ہیں کہ ڈیڑھ سو تو سیدھے سیدھے آ چکے تھے۔ میرا مطلب سرقہ فروش۔ ان کے علاوہ کچھ اور ہیں ان میں سے تمہی کہو کون سا رائٹر ہے جس نے اپنے ہیروز کو فریدی اور عمران سے نہیں نکالا۔ وہی رنگ وہی ڈھنگ وہی حرکات وہی سکنات۔ تو ہمیں کہنے دو کہ ابن صفی سے آگے پیچھے کچھ نہیں ہے۔

اور رہی بات جاسوسی تک محدود کرنے کی تو کرتے رہو۔ اس سے ابن صفی کی ہزاروں اور تمہاری تین سو کاپی جو چھپتی اس کی صحت پر کیا فرق پڑتا۔

تم اپنے ادب عالیہ جو چلنے سے قاصر ہے اس کے بڑے بڑے ناول چھاپو اور سرکاری کھاتوں میں دو تین سو کاپی بیچ کر بن جاؤ مصنف اعلی۔

ابن صفی کو کیا ضرورت ہے اس چغد قسم کے مقابلے کی۔۔ تمہاری ریس تمہی اکیلے گدھے تم ہی ونر۔ گھوڑے ہیں کدھر۔ تم بھاگو بھاگو بھاگو اور جیتو۔۔

4۔ ابن صفی نے اپنے دور میں نوجوان نسل میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے اہم کردار ادا کیا۔۔ آج نوجوانوں میں یہ شوق پیدا کرنے اور ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کو نوجوانوں تک پہچانے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟؟۔

جواب ۔ نوجوان نسل کو ٹک ٹاک دو۔ ان کو انسٹا و نسٹا دو۔ وہ پالٹی ہو رہی سے نیشا پومی تک پہنچے ہیں۔ ان کو کہاں غالب و میر اور ابن صفی پڑھاؤ گے۔

امے اس بند عقل نسل کو یہاں تک آتے آتے دہائیاں لگیں۔ پہلے اردو معلی کے چاچے ماموں نے ادب عالیہ اور ادب پوجا کا ڈرامہ کیا۔

عوامی ادب اور دلچسپی سے بھرپور کتابوں کو شجر ممنوعہ قرار دیئے رکھا۔ پھر اس بہانے اپنی ستر ستر کاپیاں بیچنے کی کوشش کرتے رہے۔

اب اونٹ نے کروٹ لے لی ہے۔ پانی سر سے اونچا جا چکا۔ پہاڑ او جھل ہو گیا۔

کبھی کسی لونڈے کے منہ سے غالب کا شعر سنا کسی سے حافظ و شیرازی کا ذکر سنا۔ یہ نسل نیشا پومی اور لڑکی بکرا کھاتی کیسے لگے گی سے آگے نہیں سوچ سکتی۔ یہ دہائیوں تک کتابوں سے ایسے دور کی گئی ہے جیسے کتاب پڑھنا گناہ کبیرہ ہو۔

اب محنت بھی ویسے ہی ہو گی نا سلیبس بدلو۔ نصاب بدلو ۔۔ ناول کتاب کہانی کو بچوں کے سلیبس کا حصہ بناؤ۔ ان کو کتاب کورس میں دو۔ ناول ڈسکشن کا حصہ بناؤ۔ یہ کوئی مذاق نہیں ہے ورنہ ہمارا تمام ادبی اثاثہ دیواروں پر آویزاں رہ جائے گا۔ ویسے بھی جس قسم کا بیہودہ ادب نما تخلیق ہو رہا اس دور میں یہ انمول ادیب باقی ہیں یہی بڑی بات۔

کتاب عام کرو اس کو اسکول کالج یونیورسٹی تک لے جاو اور آج کے خود ساختہ ادبی فوت شدگان کو چھوڑ کر حقیقی ادب کو آگے لاؤ۔

کلاسک پر ڈرامہ فلم سیزن سیریز بناؤ۔ کچھ فرق نہیں پڑتا کہ اچھا بنا یا برا ۔ تمہیں یاد ہے پہلا سپر مین کیسا تھا یا پہلا بیٹ مین۔

اہم یہ ہے کہ یہ سلسلہ جوڑ دو۔ 250 ناول ہیں دس فلم یا دو سیریز کمزور ہو سکتی لیکن یہ ریت پڑھ گئی لوگ مقصد سمجھ گئے تو یہ کہانیاں کمال کر دیں گی۔ لوگ ٹوٹ پڑھیں گے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھیں گے۔ نئی نسل کے سامنے نئے ٹول ہیں اور نیشا پومی۔ اس دور کو اس دور کے ہتھیار سے کاٹنا ہو گا۔ ان کو پیزا برگر کی طرح لت لگانی ہو گی۔

کلاسک اور بیہودگی کا فرق سمجھانا ہو گا۔ یہ ٹک ٹاک کی نسل۔ ان کو انہی کے خنجر سے نوک چھانی ہو گی۔

یہ لمبا سفر میاں کون ہے تو نقار خانے میں طوطی کی آواز سنے گا۔ یہاں روزن دیوار بند کر دیئے ہیں۔ یہاں آوازیں دب گئی ہیں۔

5۔ آپ کے خیال سے ابن صفی کے جاسوسی ناول قارئین کو حقیقت سے دور تخیلاتی دنیا میں لے جاتے ہیں یا حقیقت پسند بناتے ہیں؟ کیا ان میں کوئی سماجی اور اخلاقی پیغام بھی موجود تھا؟۔

جواب۔ ایک سوال میں چالیس سوال جمع کر دیتے ہو پھر آگے لمٹ رکھ دی ہے کہ اتنے لفظوں میں بیان کرو۔ یہ کوئی مذاق ہے کہ اتنا کچھ چند سطور میں بیان کر دیں۔ خیر کوشش کرتے ہیں۔۔

تو یہ سمجھو کہ بڑا ادب وہی ہوتا ہے جو انسان کو اس کی فکروں سے کچھ لمحوں کے لیے آزاد کر دے وہ ان لفظوں، کرداروں اور ماحول کا حصہ بن جائے۔

ناول تکیے کے نیچے بھی ہوں اور ان کرداروں کے ساتھ کہانی میں قاری بھی پیچ و خم کھاتا رہے۔ وہ کیسا بڑا ادب ہو گا کہ بھئی کمال کر دیا لکھنے والے نے مگر اس کا یاد کچھ نہیں رہا کیونکہ ادب چھالیہ تھا۔ مشکل لفظ تراکیب اور تمثیلیں تھیں۔

ادب وہی ہے جو قاری کو اپنے جہان میں لے جائے۔ اور پھر اسی قاری کے سماج کا سچ آشکار کر دے۔ فسانہ وہی بڑا ہوتا ہے جو حقیقت سے نکلے۔

اور اس میں ادب ہو۔ انسان چاہے تو لطف کشید کرے یا چاہے تو پیغام پالے۔ یہ تمام اجزا ہوں گے تو کچھ بڑا لکھا جائے گا۔ ابن صفی کے یہی کیا۔ وگرنہ ان کے ناول بھی تعداد میں 300/300 شائع ہوتے۔ کہیں دور کسی بوڑھے اور منہ میں بڑبڑ کرتے بزرگ کے پاس اک نسخہ ہوتا اور وہ لوگوں کو بتاتا کہ بڑا کمال لکھا ہے۔ کبھی پڑھنا۔ ابن صفی نے یہی کمال کیا تبھی وہ ڈسکس ہو رہے وگرنہ ہم پیٹرول کے بھاؤ پر جھک مارتے۔ یا مارکیٹ میں مہنگائی کا رونا روتے۔ ابن صفی زندہ ہے کیونکہ ان کا ادب بوسیدہ نہیں۔

6۔ اکثر اہل علم کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان ابن صفی کے ناول پڑھ کر سیکھی۔ آپ کے خیال میں ابن صفی کی تحریروں میں ایسی کون سی خصوصیات تھیں جو قاری کو زبان سکھا دیتی تھیں؟

جواب۔ اہل علم یہ کہتے۔ امے یہ مجھے کیونکر معلوم نہ ہو سکا کہ گدھوں نے بھی زبان سیکھی۔ اچھا اچھا یہ وہ جعلی ادیب نہیں ہوں گے جو تکیوں کے نیچے ابن صفی کو چھپا کر رکھتے تھے لیکن محفل میں گجنی بن جاتے تھے۔۔ ایسے بد دیانت بہت گزرے ہیں جو اپنے زمانوں کے چغد تھے۔

حیرانی تو یہ ہے میاں وہ اپنے بقول ادب پرور تھے لیکن حقیقی عوامی ادب کو ہضم نہ کر سکے۔

ویسے زبان تو سبھی نے سیکھی ہے یہ بات ماننے کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آدم بیزار زبان اور انسانی معاشرے سے کٹی زبان میں ہزاروں صفحات لکھ بھی لیے جاتے تو ان کو گنتی کے چند لوگ ایک محفل میں پڑھا کرتے تھے پھر آپس میں واہ واہ کا دور چلتا پھر اپنے ہی کسی سستے سے عظیم عالمی ڈائجسٹ میں چھاپ کر خود اپنے پاس محفوظ کر کے عظیم ادیب کہلایا کرتے تھے۔ لیکن ابن صفی کے بعد عوام کو زبان کا جو چسکا پڑا وہ ابن صفی کے پڑھے بنا لکھا نہیں جا سکتا تو ان چغدوں کو پڑھنا پڑا ہو گا۔ ویسے بھی ابن صفی کی زبان کی حیثیت مسلم ہے وہ عوامی زبان جس میں شوخی شرارت ظرافت لطافت اور تفریح موجود تھی۔ وہ گہری بات آسان لفظوں میں بیان کر جاتے تھے۔

اس کو یوں سمجھو کہ

وہ رام گڑھ سے اُس کے آثارِ قدم کا سراغ لگاتا۔ بتتبّعِ نقوشِ راہ، نواحِ شہر کے اطراف و اکناف تک جا نکلا تھا۔ بعد ازاں جب وہ مقامِ نامور و مرجعِ سیّاحاں، موسوم بہ پہاڑ گنج، در پیش ہوا تو دل گواہی دینے لگا کہ اس مردِ آوارہ طبع کی نیتِ مقام و قرار اسی خطۂ مذکور میں منعقد ہو چکی ہے۔"

یہ انداز صاحبان معلی و اعلیٰ والوں کا تھا۔ یہی بات عوامی انداز میں کچھ ایسے ہو گی۔

"وہ رام گڑھ سے اس کا پیچھا کرتا ہوا مضافات تک آ گیا تھا۔ اس کے بعد مشہور سیاحتی مقام پہاڑ گنج تھا اس کا مطلب وہ یہاں رکنا چاہتا تھا۔"

بھئی بات آسان ہو دل چسپ انداز بیان ہو گا۔ تو وہ خواص وعام میں مقبولیت کی سند حاصل کرے گا ورنہ وہی ہو گا جو اوپر بیان کر دیا۔ بس چند چغد اپنے اوپر آگہی والہام کا دعویٰ کریں گے اور معلائی مصنفین کے لفظوں سے خود اور مشکل معنی تراش کر ان کو بڑا کرتے رہیں گے۔

ابن صفی یہ نہیں کر سکے وہ عوام میں رہے بلکہ ادب میں رہے اور آج اس وجہ سے بہت سے نئے پرانے مصنفین یہ اقرار کر رہے ہیں کہ وہ ان کو پڑھ کر سیکھتے رہے ہیں۔ یہی حقیقت ہے۔

7۔ ابن صفی کے ناولوں کی ایک اہم خوبی ان کی بہترین کردار نگاری مانی جاتی ہے ان کرداروں میں کون سی خاص بات تھی جو آج بھی قارئین کے ذہنوں میں زندہ کیوں ہیں؟

جواب۔ تہوں میں کیا ہے دریا کی روانی بول پڑتی ہے
اگر کردار زندہ ہوں کہانی بول پڑتی ہے

ابن صفی کے کردار سمجھنا چاہتے ہو تو اس شعر کو سمجھو۔ ابن صفی نے اردو ادب پر احسان کیا۔ اردو ادب کو پہلی بار ایسے کرداروں کی خوشبو سے روشناس کروایا جو عالمی ادب میں تو جا بجا تھی مگر برصغیر میں اس کا تصور بھی محال تھا۔ سوچو تو سہی کہ ایسے ہیروز تراشا جن کو پڑھ کر نوجوان بچے بوڑھے بچیاں سب دیوانے ہو جائیں۔ لوگ عمران فریدی حمید جیسی حرکات کریں۔ خود کو ایکسٹو بنا کر خوش ہوں۔ لوگ حماقت کا لبادہ اوڑھ کر خود کو عمران سمجھیں۔ سنجیدگی کا چولا پہن کر فریدی کا تصور کریں۔

ایسے کردار تخلیق کرنا جو دہائیوں بعد بھی سب سے بڑے ہیں جو اپنے لگتے۔ ابن صفی نے تقسیم ہند کے شکستہ حال لوگوں کو جینے کا حوصلہ دیا ان کے غمگین چہروں پر مسکراہٹ بکھیری اور ایسے لازوال کردار پیدا کیے جو قارئین کو یہ یقین دلا دیتے ہیں کہ ان کے دیس اور مٹی سے بھی ہیروز جنم لے سکتے ہیں۔ آج کی نسل بیٹ مین سپر مین، مسٹر امریکہ کی دیوانی، کوئی ایش، گوکو، اور بین ٹن جیسا بننا چاہتی یا ان کی طاقتوں کو پانے کا تصور کرتی۔

تم سوچو ابن صفی کے تمام ہیروز ذہنی دیو تھے وہ ذہن سے طاقت ور تھے عقل سے بلند تھے کردار سے شاندار۔ اور اس دور کا ہر جوان ان جیسا بننا چاہتا تھا۔ ان کی طرح سوچنا، ان کی طرح بولنا، ان کی طرح چیزوں کا باریکی سے جائزہ لیتا تھا۔ خود کو کہانی کا کردار سمجھتا تھا۔

ابن صفی نے کردار اس قدر توانا اور بھرپور بنائے تھے کہ آج بھی وہ اسی طرح موجود ہیں۔ ان کرداروں کو کوئی چاہ کر بھی پرانا نہیں کر سکتا۔ چند عقل کے اندھوں نے ان کی نقل بنائی اور مال کمایا۔ مگر دیکھو ابن صفی کے کردار کتنے مکمل تھے کہ ان کی واہیات کاپیاں بھی لوگوں کو لکھ پتی بنا گئیں۔

ہر کردار کی مٹی پلید کر کے بھی صرف ہم نام ہونے کی وجہ سے لوگوں کا چولہا چلتا رہا۔

یہ ابن صفی کا کمال تھا کہ وہ ایسے لافانی کردار بنا گئے تھے کہ ان کا نام اور کردار کاپی کرنے والے بھی چغد قسم کے مصنف بھی اچھا خاصا کما گئے۔

ابن صفی ایک ہی تھے ان کا ہر کردار ایک ہی ہے اور رہے گا۔ اور وہ کسی دور سے نہیں جڑا ان کا ہر کردار ادب کا کردار اور اردو ادب میں ان جیسا کردار کبھی نہیں آیا نہ آئے گا۔ آج کل کے مصنف کیسے کردار بناتے ہیں دیکھو۔ کسی گدھے کا آئی کیو لیول دو سو پچاس بنا دیتے۔ کسی کو دنیا کا سب سے حسین و جمیل انسان کہہ دیتے۔ کسی کا حافظہ ایسا بنا دیتے کہ پڑھ کر ہنسی چھوٹ جاتی۔ کوئی چالیس منزلہ عمارت سے بندر کی طرح کود کر بچ جاتا۔

کوئی اکیلا ہی پوری بٹالین سے لڑ جاتا۔ یہ سب کردار مختلف قسم کے چربے اور احمقانہ قسم کے کردار۔ کسی کو پڑھ کر یہ تصور بھی نہیں آتا کہ یہ حقیقت ہو سکتا یا یہ ہمارا ہیرو۔ ایسا لگتا بس یہ پارٹ ٹائم ہیرو، اور فل ٹائم سستا قسم کا بازاری عاشق۔ اور بیچ بیچ میں کچھ اور۔

ابن صفی نے جو بنایا وہ قاری کو اپنے اندر محسوس ہوتا تھا وہ حقیقت کے اس قدر قریب لگتے تھے کہ ہر قاری خود کو ہی عمران اور فریدی سمجھنے لگتا۔

یہی کرداروں کی عظمت ہے جن کی وجہ سے وہ کردار باقی۔اور کہانیاں زندہ۔وگرنہ آج کل تو ہر اینٹ کے نیچے سے ایک دو سو پچاس آئی کیو والا بندر نما ہیرو ناچتا ہوا نکل آتا ۔اور اس کا پورا آئی کیو بس یہی کام دیتا ہے کہ اسے ہیروئن کو متاثر کر کے 14 بچوں کی اماں بنانا۔یہ کل ہیرو گیری اور پوری ذہانت ہوتی ہے کہ آغاز میں وہ دنیا کا سب سے فطین انسان اور دس صفحہ بعد اس کی پوری ذہانت بس ہیروئن کے پیچھے خجل ہو رہی ہوتی۔

سمجھے ہو یا اور بتاؤں۔

8۔آپ کی رائے میں ابن صفی کا بہترین مثبت کردار (عمران فریدی کے علاوہ) اور بہترین منفی کردار کون سا ہے اور کیوں؟۔۔

جواب۔سب سے مثبت کردار کیا ہوتا۔ہر کردار جو قانون کا رکھوالا وہ مثبت۔ک

یسے ہی چھوٹے چھوٹے کردار ہیں۔نیلم کو دیکھو۔ہدہد کو دیکھو۔کیسے سیدھا سادہ ایجنٹ مگر محنتی۔

ابن صفی کا ہر چھوٹا کردار بھی اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنے ان کے مرکزی کردار۔

ہمارے لیے تو سب بہترین۔اس کی وجہ یہی ہے کہ ابن صفی کے ہاں بھرتی کے کردار نہیں۔کہانی اور موضوع کی ضرورت ہوتے سب کردار۔اس وجہ سے سب اہم۔ڈینی کو بھول سکتے ہو؟زینت یاد ہے؟بھول سکتے ہو اسے؟

کیلی گراہم کو کون بھول سکتا؟

نواب شکور، گلرخ، موڈی، سلیمان، پلوٹونیو، صبیحہ، کنول، غزالہ ایسے سینکڑوں ہیں یہ سب ابن صفی کے قلم کا شاہکار۔

ابن صفی کو کسی ایک مرکزی کردار نے بڑا نہیں بنایا۔ان کا ہر کردار اپنی کہانی کی ضرورت۔منفی کردار بھی ایک سے بڑھ کر ایک کمال تھا۔ادبی دنیا میں اتنے مکمل کردار کسی بھی ادب میں کسی نے پیش نہیں کیے جتنے ابن صفی نے پیش کیے۔۔

فلپ، سیسرو، جابر، دینو، شاداں، رحیم گل، ڈائریکٹر بھٹی، لوسی، نرس گرٹروڈ، تھیلیما، یہ تمام کردار کیا کسی مرکزی کردار کے محتاج تھے۔یہ سب منفی تھے مگر اب اپنی اپنی جگہ پر مکمل بھی۔ان کو بھی جزئیات کے ساتھ بیان کرنے کا ہنر صرف ابن صفی کے پاس تھا۔

وگرنہ آج کل تو مجرم بھی ایسے بنتے کہانیوں میں کہ پڑھ کر انسان کو بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے کہ یہ کیا کردار اور کیوں۔نہ وہ افسانوی ہوتے نہ حقیقت، وہ کارٹون نما نمونے ہوتے بس۔

ابن صفی کے تمام کردار مرکزی ہوں یا ضمنی ہوں مثبت ہوں یا منفی ہوں وہ سبھی کے سبھی یاد رہ جانے والے وہ کہانی کی ضرورت ہوتے ہیں اور کہاں ہی ان کے ذریعے اگے بڑھتے ہیں کیونکہ اس وجہ سے کسی ایک کردار کو پسند کرنا اس کو بیان کرنا بڑا مشکل ہے یہ تمام چھوٹے چھوٹے کردار اپ کو زندگی کے مختلف مراحل میں یاد اتے رہتے ہیں اس وجہ سے میں کسی ایک کردار پر رک نہیں سکتا۔

9۔ابن صفی کے قارئین میں کئی نسلیں شامل ہیں۔ان ناولوں میں کیا چیز ہے جو انھیں آج کے ماحول پر منطبق کرتی ہے؟

جواب۔امے اوپر تفصیل سے بتا دیا ہے کہ کیونکر ابن صفی کے کردار اور تخلیقی کام ابھی بھی توانا ہے۔اوپر جا کر پڑھ لو۔نیا ڈھنگ کا سوال نہیں ہے پاس۔ابن صفی نے اردو ادب میں جاسوسی ادب کی داغ بیل ڈالی۔اسے بام عروج پر پہنچایا اس کو عوام تک لے گئے۔لچر پن اور واہیات ناولوں کے بیچ خوشبو کی طرح فضاؤں میں نکھر جانے والا صاف ستھرا معیاری ادب تخلیق کیا۔

اردو ادب کو پہلی باقاعدہ سراغ رساں سیریز دی پہلا اسپائی جاسوس دیا ۔ پہلی بار جاسوسی ناول کا معیار اعلیٰ ترین مقام پر رکھا۔
زبان کے اندر لطافت و شرارت رکھیں۔ ایسی بھرپور زبان ہے کہ غالب میاں کے خطوط یاد آ جاتے۔
کردار بنائے تو لازوال
نثر لکھی تو بس کمال
کہانی چنی تو جاندار
ابن صفی ادب میں زبان کردار کہانی اسکرین پلے منظر نگاری اور تمام ادبی لوازمات کا حسین ترین امتزاج تھے۔ ہر ذائقہ مکمل اور بھرپور تھا۔۔
اسی وجہ سے نسل در نسل ابن صفی پڑھے جا رہے۔ اور یہ سلسلہ رکنے کا نہیں۔ یہ چلتا رہے گا۔

10۔ کیا ابن صفی کو اردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا عوامی ادیب قرار دیا جا سکتا ہے؟
جواب۔ نہیں ابن صفی صرف ٹنڈوالہ یار میں پڑھے جاتے ہیں اردو میں وہ چغد زیادہ پڑھے جاتے جنہوں نے ناولوں کے ساتھ ولدیت کے خانے میں بھی نقب کی کوشش کی۔
کیسا ہی بیکار سوال ہے۔
کیا یہ کوئی نئی انوکھی اور دلچسپ بات ہے؟ اس سے قبل کیا قارئین ادب اور ادب کے خود ساختہ جغادری نہیں جانتے؟
ابن صفی کی زندگی میں ان کی ایک ایک ناول ہزاروں سے متجاوز کر گئی تھی۔ یہاں کسی کی تین سو کاپی چھپتی اس میں سے دو سو تحفہ جاتی۔ پچاس وہ کسی سرکاری ادارے کو بیچتا۔ اس کے بعد اگلا ایڈیشن آتا تو وہ کہتا میں نے اردو ادب جو وہ دے دیا جو اس سے قبل کسی نے نہیں دیا۔ پورے دو ایڈیشن پانچ سو کاپی۔ ابن صفی کو سمجھنا ہے تو اس دور میں جاؤ۔ دو سو پینتالیس ناول۔ ہر ناول ہزاروں میں چھپتا اور ہزاروں لائبریریوں میں پہنچتا وہاں سے لاکھوں قارئین اسے پڑھتے رہے۔ اس سے زیادہ کوئی تصور کر سکتا۔ یہ آخری سانسیں لیتا لائبریری کا نظام اس وجہ سے دم توڑ گیا تھا کہ ابن صفی کے نئے ناول آنا ختم ہو گئے تھے۔ ابن صفی کا لگایا ہوا شجر اتنا توانا تھا ان کے انتقال کے بعد اسے دم توڑتے بیس پچیس سال لگے۔ ابن صفی کے ناول نئے آتے رہے یا کم از کم پرانے ہی دوبارہ شائع ہوتے تب بھی یہ ادارہ قائم رہ سکتا تھا۔ یہ ابن صفی کی طاقت تھی۔ یہ ابن صفی کا کمال تھا۔ یہ ابن صفی کی مقبولیت تھی۔ یہ ابن صفی کا اردو پر احسان تھا انہوں نے کتاب جو چند چغدوں سے آزاد کروا کر کے ہزاروں لاکھوں تک پہنچانا۔
اب تم چاہو تو قرار دے دو نہ چاہو تو نہ قرار دو۔ اس سے ابن صفی کی صحت پر کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ کسی کے مرہونِ منّت تھوڑی۔ ان کا کام ہی ان کی زندگی کا اثاثہ۔ وہ آگے بڑھتا رہے گا اسے کوئی روک نہیں سکتا اور اگر تک سن سکو تو سنو اردو زبان میں ابن صفی سے زیادہ، بلکہ ان سے آدھے، بلکہ ان سے دس گنا کم بھی کوئی نہیں چھپا نہ پڑھا گیا۔
ابن صفی اپنے ہم عصروں اور نقالوں اور مداریوں سے سو گنا سے بھی زائد شائع ہوئے اور سو گنا سے بھی زائد پڑھے گئے۔
یہ مقابلہ یا سوال ہی مذاق۔ ابن صفی ہی تو ہیں جن کو پڑھا گیا۔ جن کو یاد رکھا گیا۔ باقی تو بس ان کے نام کردار وغیرہ چرا چرا کر سو دو سو کاپی شائع کر کے چولہے گرم کرتے تھے اور ادب کو ٹھنڈا۔ اس وجہ سے میں برملا کہتا ہوں کہ ابن صفی میاں سے زیادہ کسی کو پڑھا جانا ممکن ہی نہیں ۔ یہ اعزاز انہی کا ہے انہی کا رہے گا۔ یہ توڑنا تو در کنار چھونا بھی ممکن نہیں۔
ابن صفی ایک طوفان تھا جو اس خطے کو کتاب سے جوڑ گیا تھا۔ جس نے کتاب جو فیشن بنا دیا تھا۔ کبھی سنا ہے کسی چغد کی کتاب کا کوئی ایک قاری منتظر ہو کہ فلاں کی کتاب کب آئے۔ یہاں ہر ماہ لوگ لائن بنا کر کھڑے ہوتے تھے ۔ ایک پاگل پن اور جنون تھا۔
یہ انگریزی اور دوسروں میں تو ہوتا رہا ہے مگر اردو میں یہ صرف ابن صفی کے ساتھ ہوا۔ شرلاک مرا تھا تو لوگوں نے دعائیہ تقاریب کی وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

لیکن ابن صفی کے بعد عمران اور فریدی کبھی مرے نہیں وہ آج بھی اصلی حالت میں سینکڑوں جعلی نقلی اور کارٹون بی کلاس عمران کے بیچ مکمل اصلی حالت اور کیفیت میں موجود ہیں۔۔

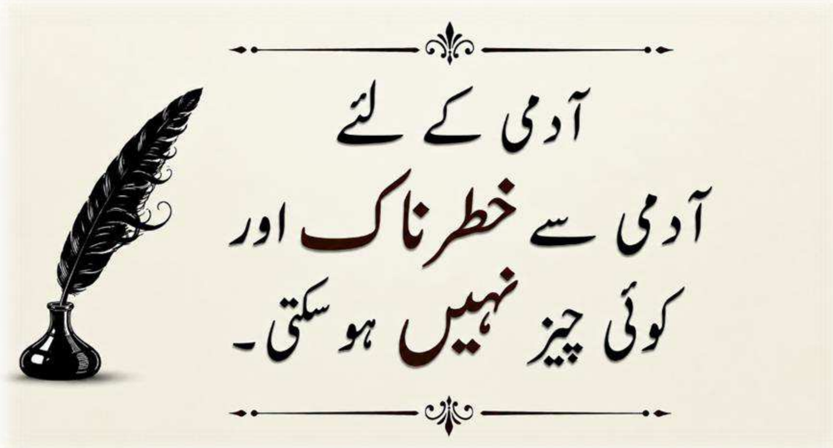

باب سوم

نقش صفی

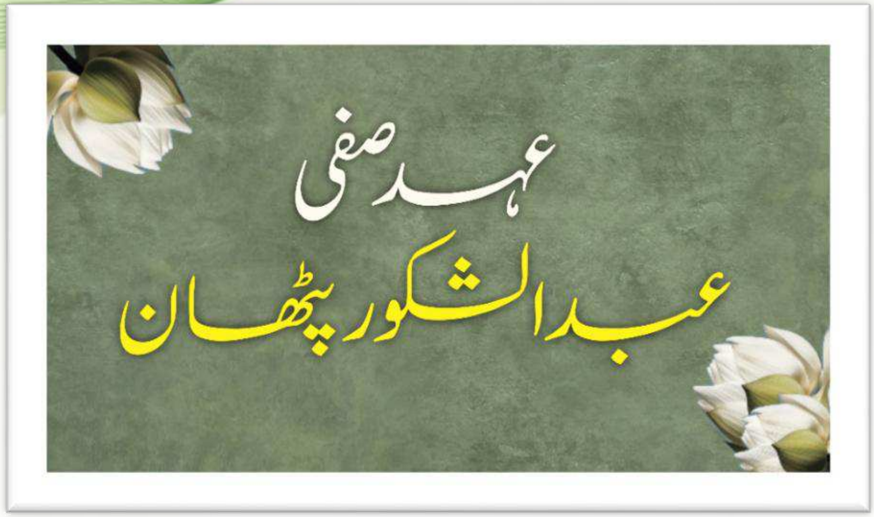

تار جام جانے والی سڑک پر فریدی کی لنکن پھسلتی جا رہی تھی۔ پچھلی نشست پر حمید پڑا اونگھ رہا تھا۔ انہیں صبح سے پہلے تار جام پہنچنا تھا۔

یہ جملے شاید اس طرح نہ تھے۔ لیکن کچھ اسی قسم کے جملے اس کتاب میں تھے جسے میں نے صبح ابا کے سرہانے سے اٹھایا تھا۔ ابا کی عادت تھی کی سونے سے پہلے کوئی نہ کوئی کتاب ضرور پڑھتے لیکن انہیں کبھی بیٹھے ہوئے پڑھتے نہیں دیکھا۔ بستر پر تکیہ سے سر اونچا کئے ایک عجیب سے انداز میں دیر تک پڑھتے رہتے۔ ہمیں حیرت ہوتی کہ ان کی گردن میں درد نہیں ہوتا، لیکن وہ ان سب سے بے نیاز کتاب یا رسالے میں مگن ہوتے۔

ابا کے سرہانے رکھی ہوئی اس کتاب میں فریدی، حمید، تار جام، ٹیکم گڑھ، انسپکٹر جگدیش اور ریکھا وغیرہ کے نام اب تک ذہن میں ہیں۔ کتاب کا نام اور کتاب میں کیا قصہ لکھا تھا یہ سب کچھ یاد نہیں۔ اور یاد بھی کیسے ہوگا کہ تیسری جماعت میں یہاں وہاں سے پڑھی ہوئی کتاب کی کہانی پچاس ساٹھ سال بعد بھلا کیسے یاد رہ سکتی ہے۔

اور یہ بات ہے سن تریسٹھ کی جب پہلی بار ابن صفی کی جاسوسی دنیا سے آشنائی ہوئی۔ ابا، امی، باجی اور میں، ہم چاروں کتابیں، رسالے پڑھنے کے شوقین تھے۔ میرے اور باجی کے لئے کھلونا، پھلواری، غنچہ، بچوں کی دنیا اور تعلیم و تربیت وغیرہ آتے تھے تو کبھی کبھار سند باد جہازی، حاتم طائی، گل بکاؤلی، گل صنوبر اور عمرو عیار وغیرہ قسم کی کہانیاں بھی آتیں۔ امی ابا کی کتابیں موٹی سی ہوتی تھیں جنہیں ہم نہیں پڑھتے تھے۔ اتفاق سے یہ ناول میرے ہاتھ لگ گیا تھا لیکن امی نے کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا تھا۔ ابا کو تو ان باتوں کی خبر ہی نہیں ہوتی تھی وہ تو صبح کے گئے شام کو گھر آتے تھے۔

اس سے اگلے سال یعنی چوتھی جماعت میں اپنی دادی اور چچا کے ہاں چلا آیا تھا جہاں بچوں کے رسالے تو بہت پڑھنے ملتے لیکن ناولوں وغیرہ کے بارے میں چچا کا سنسر بڑا سخت تھا۔ وہ بچوں کو بڑوں کی کتابیں نہیں پڑھنے دیتے تھے۔ البتہ چھٹیوں کے دنوں میں بہار کالونی کی " مخزن ادب "لائبریری سے بچوں کے ناول لانے کی اجازت تھی اور ہم " عالی پر کیا گذری "، محمود کی آپ بیتی "، میرا نام منگو ہے "قسم کے ناول بڑے شوق سے پڑھتے۔

اگلے سال میں گھر واپس آ گیا تھا لیکن اس بار ابا نے کورنگی کے ایک دوسرے علاقے میں گھر لیا تھا۔ یہاں دو کواٹروں میں بنے چھوٹے سے اسکول میں پانچویں جماعت میں داخلہ لیا۔ یہ چھوٹا سا اسکول ضرور تھا لیکن اس اسکول کی چھوٹی سی لائبریری میں کتابیں کسی بہت ہی باذوق نے منتخب کی تھیں۔ یہ کتابیں بہت دلچسپ تھیں لیکن بہت کم تھیں۔ کسی نے بتایا کہ دو کوارٹر چھوڑ کر ایک گھر میں لائبریری ہے۔

یہ " ناصر لائبریری " تھی اور یہاں ایک آنے یومیہ پر کتابیں ملتی تھیں اور اتنا ہی روزینہ ہمیں گھر سے اسکول کے لئے ملتا تھا۔ اب یا تو آدھی چھٹی میں آلو چھولے کھالیں یا لائبریری سے کتاب کرائے پر لے آئیں۔ ہمارے بس میں صرف یہ تھا کہ ناصر لائبریری کی کتابوں کی ورق گردانی کریں اور خالی ہاتھ واپس آجائیں۔

ناصر لائبریری میں آدھی سے زیادہ کتابیں جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کی تھیں۔ اس وقت تک میں نے عمران سیریز نہیں پڑھی تھی۔ جاسوسی دنیا بھی بہت زیادہ نہیں پڑھی تھی لیکن انسپکٹر فریدی اور سارجنٹ حمید (اس وقت فریدی کرنل اور حمید کیپٹن نہیں بنے تھے) ہمارے خیالی ہیرو تھے۔

پہلی جماعت سے چھٹی جماعت تک میں پانچ اسکول تبدیل کر چکا تھا۔ چنانچہ چھٹی جماعت میں گھر سے قریب ایک نسبتا "بڑے اسکول میں داخلہ لیا جو کہ نیا نیا قائم ہوا تھا اور جہاں بہت سی سہولتیں جو اسکولوں میں ہوتی ہیں، موجود نہیں تھیں۔ لیکن اس اسکول کے احاطے کے ایک کونے میں ایک چھوٹی سی دکان (جسے ٹک شاپ کہہ سکتے ہیں) موجود تھی جہاں کھٹ مٹھی گولیوں، بسکٹوں، چنے اور مرمرے وغیرہ کے علاوہ کچھ کتابیں بھی تھیں جو کرائے پر دی جاتی تھیں۔ یہاں آسانی یہ تھی کہ کلاس کا نام اور رول نمبر وغیرہ بتا کر کتاب مل جاتی تھی اور کوئی پیشگی وغیرہ نہیں دینا پڑتا تھا۔

یہاں سے پہلی مرتبہ " عمران سیریز "کی " ڈاکٹر دعاگو "کرائے پر لی۔ ڈاکٹر دعاگو پڑھنے کی وجہ یہ تھی کہ سن تریسٹھ میں ایک خوبصورت اخبار " حریت " جاری ہوا تھا اور اس میں " ڈاکٹر دعاگو "قسط وار شائع ہوتا تھا۔ جسے میں نے کبھی پورا نہیں پڑھا لیکن یادوں میں محفوظ تھا۔ اسکول کی ٹک شاپ میں ڈاکٹر دعاگو دیکھ کر یوں لگا کہ کوئی پرانا بچھڑا ہوا دوست مل گیا ہو۔

اور یہاں سے ہمارا تعارف ایکس ٹو، عمران اور اس کی ٹیم سے ہوا اور ہم اس کے دیوانے ہوتے چلے گئے۔ اور پھر یہ ہوا کہ ہمارے ایک پڑوسی کے عزیز جو ہم سے عمر میں دو تین سال بڑے تھے اور ماری پور وغیرہ میں کہیں رہتے تھے، وہ کچھ عرصے کے لئے ہمارے محلے میں رہنے آگئے۔ نام ان کا سلیم تھا۔

سلیم بھائی " عمران سیریز "کے حافظ تھے۔ عمران کے ایک ایک ساتھی کی خصوصیت، مختلف ناولوں کے مختلف واقعات، کردار انہیں، منہ زبانی، یاد تھے۔ اور یہ سلیم بھائی تھے جنہوں نے ہمارے اندر ابن صفی کے ناولوں کی جوت جگادی۔ ہم چار دوست تھے، سلیم بھائی، پرویز (اب رضوان لاری) شریف اور میں۔ شریف اور سلیم بھائی اب نہ جانے کہاں ہیں پرویز الحمدللہ کراچی میں ہے اور ان سے فیس بک کے زریعے رابطہ ہے اور دو سال قبل کراچی میں ایک شادی میں تقریباً پچاس سال بعد ملاقات ہوئی۔

یہ ہمارا ابن صفی " فین کلب "تھا۔ ناصر لائبریری اب گھر سے اٹھ کر ہمارے نئے اسکول سے کچھ آگے دو نمبر کورنگی کے بس اسٹاپ پر ایک باقاعدہ دکان میں منتقل ہوگئی تھی اور ہم دوست بھی اس قابل ہوگئے تھے کہ ایک آنہ خرچ کر کے وہاں سے کتابیں، یعنی ابن صفی کی کتابیں لاسکیں۔ اس دور میں ہم ابن صفی کو نہ صرف پڑھتے تھے، بلکہ سوچتے بھی رہتے۔ سلیم بھائی عمران کے قصے ہمیں سناتے اور خود بھی عمران کی سی حرکتیں کرتے۔ ہم چار دوست جب بھی جمع ہوتے صرف عمران، صفدر، جولیا، سلیمان، جوزف اور حمید فریدی اور قاسم وغیرہ کی باتیں ہی کرتے رہتے۔

کچھ عرصے بعد سلیم بھائی واپس ماری پور چلے گئے۔ شریف اور پرویز سے بھی میرا ملنا جلنا کم ہوگیا لیکن ناصر لائبریری سے کتابیں لانے کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔ اس بات کو میرے دوست نہ جانے کس طرح " لیں گے "کہ ابن صفی کے ناول شوق نہیں، عادت بھی نہیں، علت بن گئے تھے کہ اب ان کے بغیر رہا نہیں جاتا تھا۔ اسکول کے دنوں میں تو ہم اتنا زیادہ انہیں نہیں پڑھتے لیکن امتحان ختم ہوتے ہی پہلا کام یہ ہوتا کہ ابن صفی کا ناول لے کر آتے اور امتحانوں کی تکان دور کرتے۔ ناصر لائبریری سے میرے گھر کا تقریباً پندرہ منٹ کا پیدل راستہ تھا لیکن کبھی یہ نہ ہوا کہ اطمینان سے گھر لاکر کتاب پڑھوں۔ لائبریری سے کتاب لیتے ہی میں اسے کھول کر پڑھتے ہوئے گھر آتا۔ راستے میں راہگیروں سے ٹکراتا، لوگوں کی جھڑکیں اور ڈانٹ سنتا، کچھ دیر کے لئے کتاب بند کر دیتا، پھر یہاں وہاں دیکھ کر کتاب کھول لیتا۔ گھر پہنچنے سے پہلے ہی " پیشرس "اور دو ایک باب ختم کر چکا ہوتا۔

ایک اور عادت یا علت جو پڑی وہ یہ تھی کہ گھر میں کچھ بھی اچھا پکتا (اور انتہائی غربت میں بھی چاہے چٹنی یا دال روٹی ہو، میری امی کے ہاتھ میں قدرت نے ایک عجیب ذائقہ رکھا تھا) میں ساتھ میں کتاب پڑھے بغیر اس کھانے کا لطف نہیں اٹھا سکتا۔ یہ عادت اب تک گئی نہیں اور میری بیگم بھی مجھے اس پر ٹوکتی رہتی ہیں لیکن چھٹتی نہیں ہے۔۔

سلیم بھائی، پرویز اور شریف والا فین کلب ختم ہو گیا تو ساتویں جماعت میں میری دوستی رئیس سے ہو گئی۔ رئیس کے گھر کے سامنے ایک اور دوست " عسکری " رہتا تھا جو ہم سے عمر میں بڑا تھا۔ عسکری، " سلیم بھائی ثانی " تھا، یعنی ابن صفی کے ناولوں کا پی ایچ ڈی۔ اس کی معلومات اور یادداشت سلیم بھائی سے کہیں بڑھ کر تھیں۔ لیکن عسکری سے احترام کا رشتہ زیادہ تھا اور بے تکلفی کم تھی کہ وہ بہت سنجیدہ اور بردبار لڑکا تھا۔

اب ہمارے نئے فین کلب میں رئیس کے ساتھ اس کی بھابی بھی شامل ہو گئیں تھیں۔ بھابی کا سب سے پسندیدہ کردار " قاسم " تھا اور وہ ان ناولوں کو زیادہ شوق سے پڑھتیں جن میں قاسم کا ذکر زیادہ ہوتا۔ آٹھویں جماعت میں تھے کہ رئیس نے گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے گھر کے باہر ایک لکڑی کا کیبن بنا کر چھوٹی سی دکان ڈال لی جس میں اس نے ایک چھوٹی سی لائبریری بھی بنا ڈالی اور میرے مشوروں سے ابن صفی کے ناول لا کر رکھ دیئے۔ دراصل یہ میری خود غرضی تھی۔ میں رئیس کی دکان پر بیٹھا مفت میں کتابیں پڑھتا رہتا اور آپس کی بات ہے، میں نے آج تک ابن صفی کا کوئی ناول خرید کر نہیں پڑھا کہ ایک آنہ روز کا جیب خرچ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ آنہ لائبریری تھیں جنھوں نے میرے شوق کی آبیاری کی۔

اسکول تبدیل کرنے کا سلسلہ ابھی بند نہیں ہوا تھا۔ اگلے سال پھر دادی کے پاس کوکن سوسائٹی، عالمگیر روڈ پر رہنے آ گیا۔ اسی سال بڑے چچا نے حیدری، نارتھ ناظم آباد میں اپنا نیا گھر تعمیر کیا تھا اور ہم کچھ مہینوں کے لئے یہاں منتقل ہو گئے۔ خدا شکر خورے کو ہمیشہ شکر دیتا ہے۔ حیدری میں ہمارے گھر سے ایک گھر چھوڑ کر " آنہ لائبریری تھی۔ میری مراد بر آئی تھی۔ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں، ابن صفی کے ناول تھے اور میں تھا۔ اب چچا کو بھی " بڑوں " والی کتابیں پڑھنے پر اعتراض نہیں تھا۔ کم از کم ابن صفی کی حد تک انہیں اطمینان تھا کہ ان میں، ایسی ویسی، کوئی بات نہیں ہوتی۔ اخلاق خراب ہونے کا ڈر رومانی ناولوں میں تھا لیکن ہمیں رومانی ناولوں سے (اس وقت) کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ کچھ عرصہ بعد اپنی بہن اور کزنز کی فرمائش پر اے آر خاتون، زبیدہ خاتون، رضیہ بٹ اور سلمی کنول کے ناول پڑھے لیکن وہ بہت ہی " ویجیٹیرین " قسم کے رومانی ناول تھے۔ میں نے کہا ناں کہ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ اگلے سال جب سوسائٹی واپس آئے تو ہمارے محلے میں ایک نوجوان نے جو خود این ای ڈی کالج میں پڑھتے تھے، اپنے گھر میں " آنہ لائبریری " قائم کر دی۔ میرا کتابوں کا شوق بہار کالونی سے شروع ہوا، کورنگی سے ہوتا ہوا، نارتھ ناظم آباد اور اب سوسائٹی، کہیں بھی کم نہ ہوا اور ہر جگہ آنہ لائبریری میری پیاس بجھاتی رہیں۔ خواتین کے ناول یہیں سے پڑھنا شروع کئے لیکن عمران سیریز اور جاسوسی دنیا کی " طلب " اب تک ویسی کی ویسی ہی تھی۔

اب میں کالج میں آ گیا تھا۔ دو سال مزید سوسائٹی میں رہ کر واپس کورنگی آ گیا۔ یہاں ایک اور خوبصورت تجربہ میرا منتظر تھا۔

ہمارے دہنے ہاتھ والے پڑوسی برائے ملازمت کسی اور شہر میں تھے اور اس گھر میں ان کے چھوٹے بھائی، فیروز جن کا نام تھا، رہنے آ گئے۔ فیروز بھائی ہم سے بہت بڑے تھے۔ ریڈیو پاکستان کراچی کی لائبریری میں کام کرتے تھے، جز وقتی اناؤنسر تھے اور اکثر رات کے وقت فرمائشی پروگرام پیش کرتے۔ شاعری کرتے، افسانے لکھتے اور بطور " ابن صفی " ایک ناول بھی لکھ مارا تھا کہ ان کا تخلص " نجمی " تھا۔ وہ " چھڑے " تھے اور ان کا گھر ہمارے محلے کے نوجوانوں کا گڑھ تھا جسے ہم گناہگاروں کی جنت کہتے تھے۔۔ یہاں شام کو محلے کے سارے پڑھے لکھے نوجوان جمع رہتے تھے۔ اس گھر میں موسیقی کی محفلیں جمتیں، کرکٹ، فٹبال اور ہاکی کے میچوں کی منصوبہ بندی ہوتی۔ لیکن ایک بہت بڑا حلقہ تھا جو شعر و ادب کا شوقین تھا۔

فیروز بھائی ریڈیو کی لائبریری سے کتابیں لاتے لیکن دوستوں کو وہ کتابیں گھر لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ فیروز بھائی بغیر دودھ کی چائے بناتے جس میں لیموں نچوڑ کر ہم " قہوہ " کا لطف لیتے (اس وقت تک گرین ٹی جیسی چیزوں کا وجود نہیں تھا، بغیر دودھ کی چائے سلیمانی چائے کہلاتی تھی)۔ ہم سب ادب پرست دوست

یعنی مغل صاحب، شمیم بھائی، حامد بھائی، خالد بھائی، حبیب بھائی، خرم بھائی اور شہریار بھائی وغیرہ چائے کی چسکیاں لیتے اور فیروز بھائی اپنے ریڈیو کے مخصوص انداز میں کتابیں پڑھ کر سناتے۔ یہ سارے دوست مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ اکثر بال بچوں والے تھے یا ملازمت کرتے تھے جبکہ میں ابھی طالب علم ہی تھا۔

دوستوں کی اس ٹولی کا محبوب مشغلہ ابن صفی کے ناولوں پر گفتگو کرنا تھا۔ ہم ان کرداروں پر بات کرتے جو ان ناولوں میں کم نظر آتے لیکن یہ بڑے مضبوط اور قد آور کردار تھے جیسے انور اور رشیدہ، عمران کی دوست اور ہم راز روشی، نیولے والا طارق، عمران کا جاں نثار باڈی گارڈ جوزف، منفی لیکن مقبول کردار تھریسیا بمبل بی آف بوہیمیا اور سنگ ہی وغیرہ۔

اور دوسرا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ اگر ابن صفی کے ناولوں پر فلم بنے تو کون سے اداکار، کون سے کردار کے لئے موزوں ہیں۔ کوئی فریدی کے کردار کے لئے محمد علی یا سنتوش کا نام لیتا، حمید کے لئے وحید مراد کو تجویز کرتا تو کوئی عمران کے لئے اداکار کمال کو مناسب سمجھتا کہ وہ بے وقوف اور بھولے پن کی اداکاری بھی کرتے تھے۔ تنویر یا فیاض کے لئے اسلم پرویز کا نام تجویز کیا جاتا۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا اور ہم کبھی ان ناموں پر متفق نہ ہو سکے کہ ہر ایک کے ذہن میں اپنے اپنے فریدی، حمید اور عمران تھے۔

اور پھر یہ ہوا کہ ابن صفی کی فلم " دھماکہ " ریلیز ہوئی اور ہم سب دوست (شاید عید کا دن تھا) دوڑے دوڑے یہ فلم دیکھنے گئے اور سخت مایوس ہو کر لوٹے۔ وہ تو خیر گذری کہ اس فلم میں عمران وغیرہ نہیں تھے ورنہ نہ جانے کتنے تصورات کی دل شکنی ہوتی۔ البتہ جیمسن کے کردار پر سب متفق تھے کہ اس کے لئے " مولانا ہی " بے حد مناسب تھے (وہی شاید اس فلم کے فلمساز تھے)۔

پھر میں پردیس چلا گیا۔ کتابوں سے سلسلہ ٹوٹ گیا۔ غم روزگار میں ابن صفی، نسیم حجازی، اے آر خاتون، رضیہ بٹ، کرشن چندر، عصمت چغتائی، منٹو، اے حمید، احمد ندیم قاسمی اور منٹو وغیرہ خواب وخیال ہو گئے۔ لیکن جب کبھی کراچی جانا ہوتا ہے اور کہیں بھی ابن صفی کا کوئی ناول نظر آتا ہے تو بے اختیار اسے کھول کر پڑھنے میں مشغول ہو جاتا ہوں اور کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہوں۔

اور یہ دنیا وہ ہے جہاں کے کردار اپنی اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔ فریدی جیسا سنجیدہ، بردبار اور جری، اس کا ساتھی حمید، بظاہر لاپرواہ لیکن وقت پڑنے پر جان پر کھیل جانے والا، بے وقوف لیکن دلچسپ گرانڈیل قاسم، بظاہر بے وقوف نظر آنے والا لیکن دنیا کا شاطر ترین شخص عمران، اس کا سنجیدہ طبیعت، جانثار ماتحت صفدر، ہر وقت جلنے کڑھنے والا تنویر، عمران کا دوست لیکن دردسر فیاض، قابل اور بہادر جولیانا فٹزواٹر، بلانوش لیکن وفادار جوزف، عمران کے کپڑے پہن کر مشاعروں میں شرکت کرنے والا سلیمان، عمران کے سخت گیر والد رحمان صاحب، سیدھی سادی سی اماں بی، پیار کرنے والی بہن ثریا، ایکسٹو کے راز سے واقف سر سلطان، نیولے والا پر اسرار طارق، ذہنوں پر چھائے رہنے والے مجرم تھریسیا اور سنگ ہی۔ ان کے علاوہ لیونارڈ، بوغا اور نجانے کتنے منفی کردار۔ فریدی کے ساتھی انور، رشیدہ، جگدیش، ریکھا، فریدی کی بلیک فورس۔ عمران کے ٹیم کے رکن خاور، چوہان، نعمانی، تنویر، عمران کی جگہ ایکسٹو بننے والے طاہر صاحب عرف بلیک زیرو۔۔ رانا تہور علی خان، پرنس آف ڈھمپ اور وہ جگہیں تار جام، رام گڑھ، ٹیکم گڑھ، دانش منزل اور نجانے کیا کیا کچھ۔ اور ہاں استاد محبوب نرالے عالم اور ہدہد بھی۔

اور ابن صفی نے ہمیں کیا دیا۔ ابن صفی نے ہمیں صاف ستھری زبان سکھائی۔ استہزائیہ، استخوانی جیسے الفاظ کے معنی سمجھائے۔ ہمیں بتایا کہ بالآخر فتح سچ کی ہوتی ہے اور یہ کہ قانون ہر چیز پر مقدم ہے۔ اور یہ بھی کہ کوئی بھی گتھی لاینحل نہیں ہوتی۔ عقل، ہمت اور بہادری سے ہر معاملے کی تہہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ابن صفی نے ہمیں وطن پرستی سکھائی۔ اور کچھ نہ سکھایا ہو تو، زندگی کی بے شمار گھڑیوں میں ہمیں بے حساب سکون عطا کیا۔ ابن صفی کو پڑھ کر ہم زندگی کے آلام ومصائب سے کچھ دیر کے لئے ہی سہی، اپنے آپ کو دور رکھتے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک ابن صفی نے مجھے اور میری نسل کو صاف ستھرا، دلنشین اور دلچسپ ادب عطا کیا۔

اور میری خوش بختی دیکھئے کہ آج اسی ابن صفی کے بیٹے میرے عزیز ترین دوستوں میں ہیں۔ یہ احمد صفی ہی کی حوصلہ افزائی تھی کہ آج میں بھی چند سطریں لکھنے کے قابل ہوا۔

اور یہ ابرار بھائی ہیں جو میری پیٹھ ٹھونکتے ہیں تو سیروں خون بڑھ جاتا ہے۔

خدا اس خانوادے کو شاد و آباد رکھے اور ابن صفی کو اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے۔ آمین۔

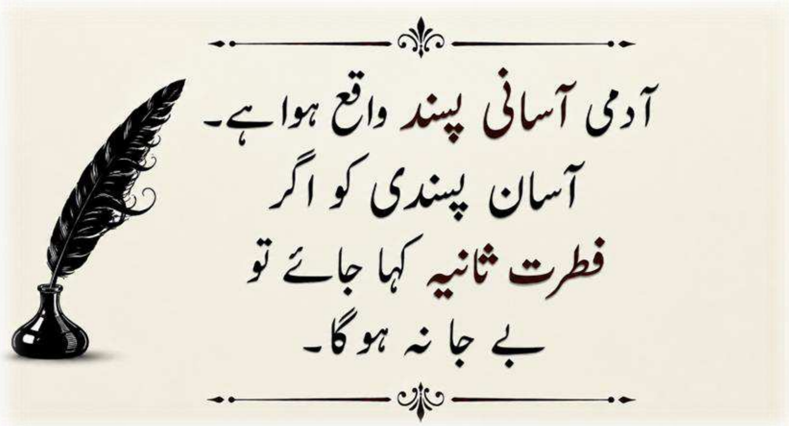

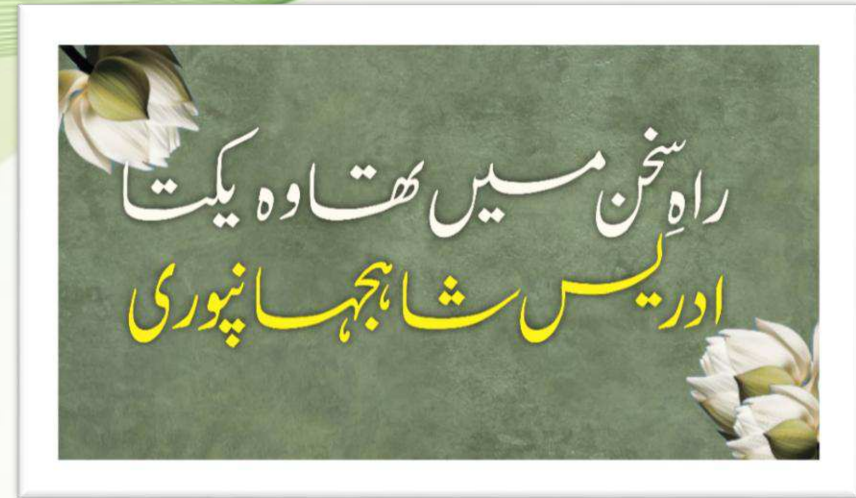

ابھی سے کیوں شام ہو رہی ہے　　　ابھی تو جینے کا حوصلہ ہے

شاید وکٹر ہیوگو ہی نے کہا تھا: ''زندگی کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہو لیکن تاریخ اپنے فیصلے کے لئے ہمیشہ موت کا انتظار کرتی ہے۔'' یہ مقولہ دیگر لوگوں کے لئے ممکن ہے صحیح ہو لیکن ابن صفی کے لئے تاریخ نے اپنے ہی بنائے ہوئے اصول سے روگردانی کی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ گواہ ہے کہ مشاہیر ادب کی قدر ان کی موت کے بعد ہوئی ہے اور شائد آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا، لیکن ابن صفی کی قدر قیمت کو ان کی زندگی میں ادب کے خود ساختہ پنڈتوں نے بھلے ہی قابل اعتنا نہ سمجھا ہو مگر ان کے لاکھوں پرستاروں نے ابن صفی کی عظمت کی گواہی ان کی حیات میں ہی دے دی تھی۔ لہٰذا انھوں نے ان کو اپنے سر چڑھایا اور ان کی تخلیقات کو گودوں کھلایا۔ اس لئے تاریخ ادب مجبور ہے کہ وہ دلوں کے تاثرات کو لوح زمانہ پر کندہ کر کے محفوظ کر لے۔ بالفاظ دیگر اس جہان فانی سے کوچ کرنے کے بعد شہرت کی سربلندی سے بہت سے ادیب سرفراز ہوئے، مگر تاحیات اور بعد میں بھی ابن صفی جیسی داد و تحسین اور عقیدت و احترام شاید ہی کسی اور مصنف کے حصے میں آئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی حیات میں قارئین نے ان کی تخلیقات کی جہاں کافی پذیرائی کی تو دوسری طرف اس جہان فانی سے ان کے رخصت ہونے کے بعد بھی ان کی خدمات پر سیمینار ہو رہے ہیں، ان پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں تفویض کی جا رہی ہیں اور ان کے فن کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقات کے نئے نئے دروازے کھل رہے ہیں جن کے تحت، ''ابن صفی مشن اور ادبی کارنامہ'' از عارف اقبال، ''فنگر پرنٹس (ابن صفی کی قلمی جولانیاں)'' از راقم الحروف، ''کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا'' از راشد اشرف، '' دانش منزل'' وغیرہ از خرم علی شفیق ''سری ادب کا پہلا اور آخری آدمی'' از صہیب اکرام و تبسم حجازی وغیرہ وغیرہ جیسی کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔ وہ سری ادب کے میدان میں بعد میں بھی آئے اور پہلے بھی۔ بعد میں اس لئے کہ ان سے پیشتر بھی سریات کے گوشوں کو تراجم کی شکل میں اچھوتا نہیں چھوڑا گیا تھا اور پہلے اس لئے کہ انھوں قارئین کے سامنے ادبی طنز و مزاح، زبان و بیان کی چاشنی اور اچھوتی منظر نگاری سے بھرپور اولین معیاری سری ادب پیش کیا۔ اس زمانے میں ان زاویوں پر مشتمل سری ناولوں کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جاسوسی ناول نگاری سے قبل، انھوں نے شعر و شاعری کے میدان میں بھی اپنی فکر کے مرکب دوڑا کر قرطاس فکر و خیال پر خامہ فرسائی کی تھی مگر چونکہ وہ مشاعروں کے شاعر نہ تھے اس لئے اس اسٹیج سے ان کی شہرت نے ان کو آواز نہ دی مگر ان کے ذہن کے مخملیں گوشوں سے جو شاعرانہ تعلی کی کرنیں پھوٹیں انھوں نے ان کو مشاعروں کے بغیر ہی انفرادیت عطا کر دی تھی۔ اُس وقت جاسوسی ناولوں میں موجود، فحاشی کے طوفان کا سدباب کرنے کے لئے اگر انھوں دوستوں کا چیلنج قبول نہ کیا ہوتا تو اپنی فنی فطانت کے باعث وہ شاعری میں بھی وجدان حاصل کرتے اور اس میدان میں بھی سری ادب کی شہرت سے آگے نکل گئے ہوتے۔ بقول ان کے:

جو کہہ گئے وہی ٹھہرا ہمارا فن اسرارؔ
جو کہہ نہ پائے نہ جانے وہ چیز کیا ہوتی۔

اسرارؔ ناروی (ابن صفی) کے شعری ارتقاء کے ہم سفر بنیں و ہم اس ابتدائی دور میں پہونچ جاتے ہیں جب انھوں نے اپنے ماموں جناب نوحؔ ناروی (جانشین داغؔ دہلوی) سے اصلاح لی تھی۔ اس کی شروعات آٹھویں جماعت سے ہوئی۔ نظم و نثر میں ان کے قلم کی پختگی ایسی تھی کی پڑھنے والے کو ان کی شخصیت پر کسی بزرگ قلم کار کا گمان ہوتا تھا۔ اگلا پڑاؤ میٹرک کا ہے جس کے دوران انھوں نے اردو کے استاد مولانا محمد متین شمس کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔ بعد ازآں فراقؔ گورکھپوری، سلامؔ مچھلی کی شہری اور وامق جونپوری محفلیں میں اپنی نظمیں سنائیں۔ اس دور میں یہ بڑے فخر کی بات تھی کیوں کہ فراقؔ بہر حال ایک معتبر شاعر تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاعروں کے حواس پر جگرؔ مراد آبادی بری طرح چھائے ہوئے تھے۔ اسرارؔ بھی اس اچھوتے نہیں رہے اور انھوں نے بھی دیگر شعراء کی تقلید میں خمریات پر طبع آزمائی شروع کر دیا۔ انھوں نے ایسے تخلیقی جام لنڈھائے کہ بعض اوقات ان کے قریبی شناساؤں کو شبہ ہونے لگا کہ انھوں نے سچ مچ مے سے تو شغف شروع نہیں کر دیا؟ مثلاً:

ہمیں تو ہے مئے گل رنگ رخاں سے غرض
بنائے کفر پڑی کس طرح خدا جانے
بس اتنا یاد ہے اسرار وقتِ مے نوشی
کسی کی یاد بھی آئی تھی مجھ کو سمجھانے

یا پھر

یہ تشنگی کے لئے خوشبوئے مئے گل رنگ
سہاگ رات میں ہو بوئے پیرہن جیسے

میٹرک میں پہنچتے ہی ان کی نشست و برخواست بے پی کمیونسٹوں کے ساتھ ہونے لگی۔ انھوں کھدر پہننا شروع کر دیا، گول شیشوں والی عینک لگانے لگے اور ترقی پسندوں کی نقل میں سر کے بال بھی بڑھانا ضروری خیال کیا۔ ان کمیونسٹوں کا ساتھ ہوتے ہی ظالم سماج اور سرمایہ داری ان کی شاعری میں گھس آئے۔ لیکن ان دنوں وہ محلے کے بنیے کو سرمایہ دار سمجھتے تھے اور اپنی برادری والوں کو ظالم سماج، کیوں کہ برادری سے باہر شادی کرنے پر پابندی عائد تھی لہٰذا اپنے ہی خاندان کے کچھ بزرگوں کو انھوں نے سماج کے ٹھیکے دار ٹھہرایا۔ بقول ان کے "میں دل ہی دل میں ان پر غرا کر شاعری کیا کرتا اور جب محلے کا بنیا کسی قرض خواہ سے الجھ پڑتا تو سرمایہ داری کی شامت آجاتی ایسی دل ہلا دینے والی نظم لکھتا کہ بعد میں اس بنیے پر رحم آنے لگتا۔"

الہ آباد منتقلی کے بعد انھوں نے اپنے والد کے ساتھ حسن منزل میں قیام کیا جہاں ان کی دوستی عباس حسینی اور ان کے بھائی جمال رضوی (شکیل جمالی) سے ہوئی۔ ان دوستوں میں ایک قدر مشترک تھی یعنی ادبی ذوق لہٰذا ان کا ایک گروپ سا بن گیا تھا۔ جس میں عباس حسینی کے رشتے کے بھائی، نامور مصور سرور جہاں، ابن سید (مجاور حسین)، ڈاکٹر راہیؔ معصوم رضا، اشتیاق حیدر، یوسف نقوی، نازش پرتاب گڑھی اور تیغ الہ آبادی (مصطفی زیدی) بھی شامل تھے۔

اسی سال انھوں نے کالج کے سالانہ مشاعرے میں اپنی نظم "بنسری کی آواز" پڑھی اور خوب داد وصول کی۔ انگریزی کے ان کے استاد ہگنس صاحب کو اردو شعر و شاعری سے بھی بڑا شغف تھا۔ دوسرے روز انھوں نے کلاس میں کہا "فراق صاحب کی رباعیات اور "بنسری کی آواز" کے علاوہ مجھے تو سب کچھ شاعری کی بازگشت معلوم ہو رہا تھا۔" اردو شعبے کے صدر مولانا انوار الحق نے ان کے بارے میں پیش گوئی کی تھی کہ اسرارؔ ناروی کا شمار ایک دن ملک کے بڑے شاعروں میں ہوگا۔

1947ء میں اسرار احمد جب الہ آباد یونیورسٹی پہنچے تو بطور شاعر ان کی شہرت پہلے ہی وہاں پہونچ چکی تھی۔ ان کے استاد ڈاکٹر اعجاز حسین بھی ان کی شاعری کے بے حد معترف تھے۔ ان کی شاگردی نے اسرارؔ کی تخلیقی صلاحیتوں کو مزید صیقل کیا۔ بعد میں جب انھوں نے اسرارؔ ناروی کا چولا اتار کر ابن صفی کا قلمی نام اختیار کیا تو شاعری کی طرف سے عدم توجہی کے باعث اعجاز حسین ہمیشہ ان سے سے ناراض رہے۔ ان کا خیال تھا کہ ابن صفیؔ نے اسرارؔ ناروی کو قتل کر دیا ہے۔

1947 کی تقسیم وطن نے ابن صفی کے حساس ذہن پر کچھ اچھا اثر نہیں چھوڑا۔ ایک طرف تو وہ خوش تھے کہ وطن عزیز کو آزادی نصیب ہوئی مگر دوسری طرف تقسیم کے دوران ہونے فسادات اور تباہی و بربادی نے ان کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیا۔ ''آزادی کی دیوی'' ان کے اسی احساسات کی ترجمان ہے:

آزادی کی دیوی آئی، خوشیاں آج مناؤنا

اے دکھیارو آنسو پونچھو، میں کہتا ہوں گاؤنا

بھول ہی جاؤ فاقہ کش ہو، گھر گھر دیپ جلاؤنا

گھر گھر دیپ جلاؤنا

جنوری 1948 میں الہ آباد کے ایک سہ روزہ اخبار ''نیادور'' کے گاندھی نمبر میں ان کی نظم ''سوگ'' شائع ہوئی جو انھوں نے مہاتما گاندھی کی شہادت پر لکھی تھی ۔ اس وقت ابن سعید اس اخبار میں سب ایڈیٹر تھے۔ اس کا ایک شعر بہت مشہور ہوا تھا۔

لویں اداس چراغوں پہ سوگ طاری ہے

یہ رات آج کی انسانیت پہ بھاری ہے

ابن صفی لکھتے ہیں۔۔'' 1948 کے اواخر تک ذہن کا تخلیقی گوشہ ویران ویران سا رہا، پھر اچانک بعض دوستوں کی تحریک پر وہ برف پگھلی اور میں ماہنامہ 'نکہت' کے الہ آباد کے لئے طنزیات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ طغرل فرغان کے نام سے متعدد طنزیہ مضامین اور افسانے لکھے۔ کچھ پیروڈیز بھی لکھیں لیکن میں اس سے مطمئن نہیں تھا۔ کچھ اور کرنا چاہئے۔''1

ابن صفی کی فکر و نظر میں جیسے جیسے پختگی کا رنگ غالب آنے لگا ویسے ویسے ان کی شعری تخلیقات میں بھی نکھار آتا گیا۔ ابتدا میں انھوں جس جذباتیت کا مظاہرہ کیا تھا اس پر سنجیدگی غالب آنے لگی۔ ابتدائی دور میں انھوں نے زیادہ تر روایات کا سہارا لیا ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں محبت اور سرخوشی کی کیفیت نمایاں ہے اور کلام میں اثر پذیری کا عنصر مقابلتاً کم ہے۔ اس دور میں ان کا شاعرانہ تخیل پیار و محبت اور امن کا عکاس ہے۔ ساتھ ساتھ انھوں نے زلف اور لب و خسار کے علاوہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بھی شعری تخلیقات میں ڈھالا ہے۔ چند مثالیں جو نوجوان ذہن کے کرب و اضطراب اور انسانی وحشتناکیوں کی عکاس ہیں۔

لہو لہو ہے شفق شام مضمحل سی ہے

تم ہی بتاؤ کہ ان سرخیوں سے کیا حاصل

--

اتر تو آئی ہے جاڑوں کی دھوپ آنگن میں

مگر پڑوس کا دو منزلہ بھی گھات میں ہے

--

یہ جس کا سایہ گھنا گھنا ہے

بہت کڑی دھوپ جھیلتا ہے

--

مسیح کون بنے سارے ہاتھ آلودہ

لہولہان ہے دھرتی کہاں سے مرہم آئے

یوں دیکھا جائے تو1952 اور 1953 کا زمانہ ان کی شاعری کا اصل زمانہ ہے۔اس وقت کی غزل میں سماجی شعور واضح انداز میں جھلکتا ہے۔ ان کی شاعری کا دوسرا دور ان کے قیامِ پاکستان سے شروع ہوتا ہے۔ ابتدا میں تو انھوں نے مشاعروں میں شرکت کی تھی مگر پاکستان پہونچنے کے بعد وہ مشاعروں سے کٹ گئے تھے۔ ہاں نجی محفلوں میں ان کے احباب، ان کے کلام سے ضرور محظوظ ہوا کرتے تھے۔ ان کا ترنم بہت خوبصورت تھا جب کہ تحت اللفظ بھی سامعین کو مسحور کر دیا کرتا تھا۔ مشاعروں سے دوری کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی جاسوسی ناول نگار کی حیثیت سے ان کی شہرت، شاعرانہ تخلیقات پر غالب آنے لگی تھی۔ البتہ انھوں نے شاعری سے بالکل بھی کنارا نہیں کیا تھا اور عمر کے آخری دور تک وہ شعر کہتے رہے تھے۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس دور کی کسی غزل میں بھی ابن صفی نے اسرارؔ تخلص استعمال نہیں کیا۔ شراب و شباب کا تذکرہ اس دور کی غزلوں میں نہ ہونے کے برابر ہے، بلکہ اس کے بجائے معاشرتی سوچ کی فراوانی نظر آتی ہے۔ شاعری کے اس دور میں ابن صفی اپنے دل سے نہیں دماغ سے کام لیتے نظر آتے ہیں اور کسی جذباتی عاشق کے بجائے سنجیدہ، منجھے اور تجربے کار مدبر کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ اس میں صرف غزلیں ہی نہیں بلکہ حالات حاضرہ سے متاثر نظمیں بھی لکھی گئی ہیں:

مکر وریا ہو مسندِ شاہی کے گرد اگر

صدق و صفا کا پھر تو مقدر صلیب ہے۔

ابن صفی نے اسرارؔ ناروی کے نام سے غزل اور نظم دونوں اصناف کو اپنی فکر کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے لیکن بغائر نظر دیکھا جائے تو نظم کے مقابلے میں ان کی غزل گوئی زیادہ شائستگی اور انفرادیت کی حامل ہے۔ ان کے یہاں بیشتر شعراء کی طرح غور و فکر کی آورد نہیں ہوتی بلکہ ان کی زبان اور ہونٹوں سے الفاظ از خود اشعار کے جگنوؤں میں ڈھل کر اپنی آمد درج کراتے ہیں:

قفس کی داستان ہے اور ہم ہیں

اشاروں کی زبان ہے اور ہم ہیں

شمار زخم ہائے دل کہاں تک

حساب دوستاں ہے اور ہم ہیں

غزل کی وادی میں فکر کے غزالوں کو اپنے تصورات اور نظریۂ حیات سے مربوط رکھ کر وہ جس آن بان وشان اور سبک روی سے گذرے ہیں اس سے ان کی جمالیاتی حس، سماجی شعور اور زندگی کو ایک خاص نظر سے دیکھنے کی عکاسی ہوتی ہے۔ ان کی غزلوں میں نازک احساسات اور کیفیات کے تانے باتے بے حد فنکارانہ اور خوبصورت انداز میں بنُے گئے ہیں۔ ابتدا میں انھوں نے جگرؔ کے رنگ سے استفادہ کیا ہے:

ہمیں تو ہے مئے رنگ و گل رخاں سے غرض

بنائے کفر پڑی کس طرح خدا جانے۔

اور

شریک بزم ہوئی جب سے چشم ساقی بھی

ہر ایک جام سے چھلکے ہزار پیمانے

یا پھر

بس اتنا یاد ہے اسرارؔ وقت مے نوشی

کسی کی یاد بھی آئی تھی مجھ کو سمجھانے

ابتدائی دور کے بر خلاف۔ ان کی دوسرے دور کی غزلوں اور نظموں کا رنگ زیادہ انفرادی ہے اور کلام میں درد، غالب ہو گیا ہے۔ یہاں وہ استادانہ رنگ میں نظر آتے ہیں۔ زبان و بیان پر مزید گرفت حاصل ہو گئی ہے اور اخلاقی رنگ جھلکنے لگا ہے۔ کلام میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی ہے۔ بیان میں دلکشی و جاذبیت، خیالات میں سادگی اور دردمندی کا اظہار ہونے لگا ہے:

وہ جس کا سایہ گھنا گھنا سا ہے

بہت کڑی دھوپ جھیلتا ہے۔

اچٹی ہے جو نیند پچھلی شب سے

بیٹھا ہوں اداس جانے کب سے۔

یہ شاہراہِ محبت ہے، آگہی کیسی

بجھا سکو تو بجھا دو شعور کی قندیل۔

بجھ گیا دل تو قیامت ہو گی

پھر کسی شعلہ جبیں سے ملئے۔

زمیں سے تا بہ فلک عجیب عالم ہے

زمیں کی کون کہے بزم قدسیاں ہیں اداس

ابن صفی نے اسرارؔ ناروی کے چولے میں جہاں روایتی تشبیہات، استعارات اور فنی محاسن سے اپنے شعور کو جلا بخشی ہے انہیں سلیقہ سے برتا ہے، وہیں خود بھی نت نئے استعارے، نئی نئی تشبیہات اور تراکیب ڈھالی ہیں۔ اس طرح اردو کے خزانے میں بیش قیمت موتیوں کا اضافہ کیا ہے۔ جیسے رشک غزالاں، روحوں کے ویرانے، تلاشِ حسن و حقیقت، ذروں کا انکسار وغیرہ وغیرہ۔ شعر میں ایک مثال:

دکھائی دی تھی جہاں سے گناہ کی منزل

وہیں ہوئی تھی دلِ ناصبور کی تشکیل

اور

ملک طرب کے رہنے والو! یہ کیسی مجبوری ہے

ہونٹوں کی بستی میں چراغاں، دل کے نگر اتنے سنساں

ان کی بانہوں کے حلقے میں عشق بنا ہے پیر طریق

اب ایسے میں بتاؤ یارو! کس جا کفر کدھر ایماں

اپنے نرالے طرز بیان، اور اچھوتے اظہار خیال وہ منفرد نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں سادگی اور پرکاری ہے اور کہیں کہیں تو بلا کا درد جھلکتا ہے۔

میرے لبوں پر یہ مسکراہٹ

مگر جو سینے میں درد سا ہے

--

اچٹتی ہے جو نیند پچھلی شب سے

بیٹھا ہوں اداس جانے کب سے

آنکھوں میں پڑھ سکو تم

وہ بات نہ سن سکو گے لب سے

بالآخر تھک ہار کے یارو ہم نے بھی تسلیم کیا

اپنی ذات سے عشق ہے سچا باقی سب افسانے ہیں

شاعری اور طنز و مزاح نگاری کے میدان میں اپنی تخلیقیت سے ان کے ذہن کی تشنگی بجھتی نظر نہیں آرہی تھی۔ ہل من مزید کی طلب بڑھتی ہی جارہی تھی اور ایک دن یہ طلب ان کو جاسوسی ناول نگاری تک لے گئی۔ مگر جاسوسی ناول نگاری میں بھی ان کا شاعرانہ ذہن غالب رہا۔ لہٰذا زبان و بیان کی چاشنی ہو یا ناولوں کے عنوانات جو کسی شاعر کی غزلوں سے زیادہ خوبصورت ہیں، ہر ایک کے پس پشت ان کی شاعرانہ جبلت کارفرما نظر آتی ہے۔ ایک انٹرویو میں قرۃ العین حیدر نے کہا تھا:

"........زیادہ تر جو دنیا کا ادب ہے اس کی بنیاد رومانٹک ہی ہے۔ رومانٹک اپروچ۔...... یہاں رومانٹسزم سے میرا مطلب وہ رومانس نہیں ہے، عشق و محبت کا چکر نہیں ہے، یہ ایک یکسر مختلف شے ہے، تو یہ ہے کہ آپ احساس، کھوج اور کرید، حسیت، وفور جذبات، تخیل اور تحیر، انفرادیت پسندی اور جو کچھ ہے مطلب یہ ہے کہ جتنی اس طرح کی چیزیں ہیں، انہی سے رومانی جذبہ بنتا ہے۔ وہ جو ادب کا رومانٹک اپروچ ہے، وہ بالکل ضبط و توازن، تنظیم، خیالات کی صراحت، ان باتوں سے مختلف چیز ہوتی ہے....."[2]

اسی رومانٹک اپروچ، خیالات و افکار کی ندرت اور جذبات، تخیل و تحیر نیز انفرادیت پسندی نے ہی ان سے لیک ہٹ کر جاسوسی ناول لکھوائے اور ان ہی عناصر نے " ابن صفی کو، اسرار ناروی کو قتل کرنے پر مجبور کر دیا۔

اسرار ناروی نے "متاع قلب و نظر" کے نام سے اپنا شعری مجموعہ ترتیب دیا تھا جو ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند ارجمند احمد صفی نے شائع کرایا ہے:

تنہائی سی تنہائی ہے کیسے کہیں، کیسے سمجھائیں
چشم ولب ورخسار کی تہہ میں روحوں کے ویرانے ہیں

حوالہ جات:

1. [1]ابن صفی: "میں نے لکھنا کیسے شروع کیا"۔۔ماہنامہ تلاش جدید، شمارہ8، جلد2، دہلی، اگست 1989
2. [2]مظفر حسین سید: "قرۃ العین حیدر کی فکر اوار ان کے طرز تحریر کو کسی دائرے میں قید نہیں کیا جاسکتا۔"، صفحہ ادب و صحافت، روزنامہ انقلاب، دہلی، 17 ستمبر 2024
3. اداریہ: "ابن صفی"۔۔ماہنامہ فانوس، کراچی، 14 مئی، 2018

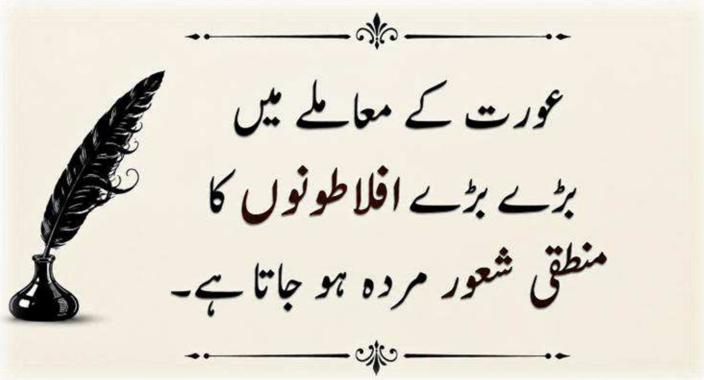

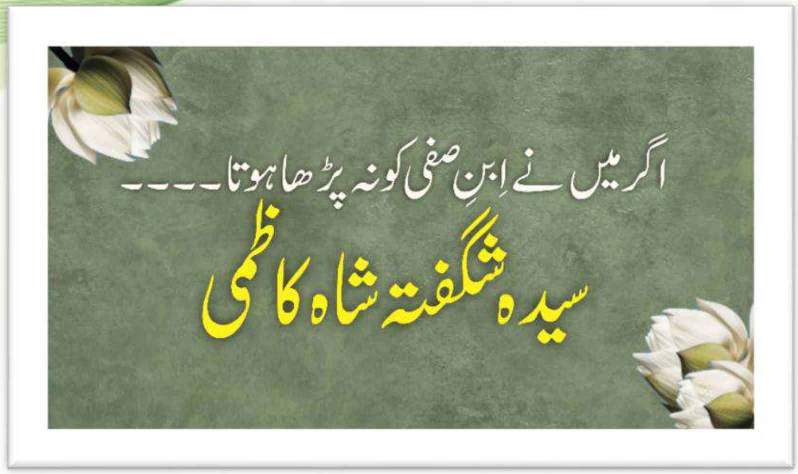

ابنِ صفی کے فن اور شخصیت پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان کے جاسوسی ناولوں کے ہر پہلو اور کردار کا احاطہ کیا جا چکا ہے یہاں تک کہ پی ایچ ڈی بھی ہو چکی ہے۔ ان کے ناولوں کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس کو کسی نے فوکس نہیں کیا ہے (کم از کم میری معلومات میں نہیں ہے۔) آج اس موضوع پر بات کرنا چاہتی ہوں۔

میں نے میٹرک کرنے کے بعد ابن صفی کو پڑھنا شروع کیا تھا۔ یہ اسٹوڈنٹ لائیف کا دور تھا۔ عمر بھی کم تھی، معلومات بھی اور دنیا کا تجربہ بھی محدود تھا اس لئے عمران سیریز اور جاسوسی دنیا کے ناولوں میں بیان کی ہوئی کچھ باتوں کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ کرنل فریدی نواب زادہ ہونے کے باوجود پولیس کے محکمے میں کام کرتے تھے اور بد مزاج اور نااہل آفیسروں کے رویوں سے تنگ آکر ہمیشہ استعفیٰ دینے کے لئے تیار رہتے تھے دوسرے لفظوں میں استعفیٰ ہمیشہ ان کی جیب میں ہوتا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ بھلا اس قدر مالدار شخص کو نوکری کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اتنی بڑی کوٹھی، نوکر چاکر، مہنگی گاڑیاں۔۔۔ سب کچھ تھا پھر نوکری کرنے اور تند خو افسروں کی باتیں کیوں برداشت کرتے تھے۔ یہ بات بہت عرصے کے بعد سمجھ میں آئی کہ جاسوسی کا شوق پورا کرنے کے لئے کسی سرکاری ادارے سے وابستہ ہونا ضروری تھا ورنہ کیس کیسے ملتے۔

ہمیں یہ بات تب سمجھ میں آئی جب نوکری کرنا شروع کی۔ ٹھیک ہے ہم فریدی صاحب کی طرح بہت دولتمند نہیں تھے پھر بھی اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تھے۔ نوکری کرنا اس لئے ضروری تھا کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے اور نوکری نہیں کریں گے تو اپنے ٹیلنٹ کو کیسے کام میں لائیں گے یہ اور بات ہے کہ نوکری کرنا ہمارے مزاج کے مطابق نہیں تھا۔ اوپر سے قدرت نے کچھ ایسے " جوہر "ہمارے اندر رکھے تھے جو نوکری کرنے کے بعد ظاہر ہوئے یا شاید عملی زندگی کے تلخ حقیقتیں تھیں جن کو لوگ اپنے اپنے طریقوں سے فیس کر کے رد عمل دیتے ہیں۔

کچھ لوگ نوکری کو نوکری سمجھ کر ہر زیادتی کو یہ کہہ کر برداشت کرتے ہیں کہ یہ باتیں تو نوکری کا حصہ ہوتی ہیں، ان کو خاموشی سے سہنا پڑتا ہے، کچھ لوگ چالاکی اور چاپلوسی کی سیڑھی استعمال کر کے اوپر پہنچ جاتے ہیں اور کچھ ہم جیسے ہوتے ہیں، ناانصافیوں اور زیادتیوں پر نہ تو خاموش رہ سکتے ہیں نہ ہی چاپلوسی کو" پروفیشنل ایٹیٹیوڈ " سمجھ کر" یس مین yes man "بنناہے تو پھر ایک ہی راستہ بچا۔۔۔ لڑنا ہے۔ غلط رویوں کے خلاف، ناانصافیوں کے خلاف اور کرپشن کے خلاف۔ اس قسم کی صورتحال میں میرا استعفیٰ ہمیشہ تیار رہتا تھا تب مجھے فریدی بہت یاد آتا تھا۔ مجھ پر یہ راز کھلا کہ استعفیٰ تیار رکھنے سے ایک طاقت سی مل جاتی ہے۔ ملازمت کرنے والے ملازمت کھونے کے ڈر کی وجہ سے

بہت کچھ برداشت کرتے ہیں کیونکہ ان کو اپنی فیملی کو سپورٹ کرنا ہوتا ہے، وہ اپنی فیملی کا رزق کھونے سے ڈرتے ہیں اس لئے بزدل بن جاتے ہیں مگر ہماری فیملی کو ہماری سپورٹ کی ضرورت نہیں تھی اس لئے نوکری کھونے کا ڈر نہیں تھا کہ نوکری چلی گئی تو کہیں اور کام ڈھونڈ لیں گے۔ یہ احساس انسان کو بہادر بناتا ہے۔

میں ایک تعلیمی ادارے میں معلمہ کی حیثیت سے جاب کر رہی تھی۔ وہاں پر ہونے والی زیادتیوں پر بولتی تھی جس کی وجہ سے بہت اہم زمیداریاں ملنے اور ان کو پورا کرنے کے لئے بے انتہا کام کرنے کے باوجود میں اپنے افسروں کے good books میں کبھی بھی نہیں رہی۔ افسروں کے لئے ہمارا حق کے لیے آواز بلند کرنا misconduct تھا۔

ایک مرتبہ ایک سخت مزاج اور ڈکٹیٹر ٹائپ کا بندہ ہمارے ادارے کا سب سے بڑا افسر بن کر آیا جن کی عمر 74 سال سے اوپر تھی اور اپنی سروس کے دور میں جس جس ادارے میں افسر رہے وہاں کرپشن میں involve رہے اور بقول شاعر " جہاں بھی گئے، داستان چھوڑ آئے۔"

نصیب ایسے کہ صوبائی وزیر اعلیٰ سے قربت کی وجہ سے اس عمر میں بھی افسری مل گئی۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اس نے ادارے کا بیڑا غرق کرنا شروع کیا۔ اس نے اپنا ایک گروہ بنالیا جب کہ اس کی مخالفت میں بھی ایک گروہ بن گیا۔ دھڑلے سے جسے چاہ رہے تھے نوکری دے رہے تھے اور من پسند جونیئر اساتذہ کو سینیئرز پر فوقیت دے کر ترقیاں دے رہے تھے۔ اپنے ہمنوا گروپ کے لوگوں کو عہدے اور فائدے مل رہے تھے اور مخالفین کو دھمکیاں اور جھڑکیاں ملتی۔ جب زیادتیاں بہت بڑھ گئیں اور ادارے کا ماحول خراب ہونے لگا تو مخالف گروہ نے اس افسر کی زیادتیوں کے خلاف پریس کلب کے سامنے احتجاج کرنا شروع کیا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم کس گروپ میں شامل تھے۔۔۔جی احتجاج کرنے والے گروپ میں۔ عموماً خواتین زیادہ ڈرپوک ہوتی ہیں اس لئے جن خواتین اساتذہ کے ساتھ ناانصافی ہورہی تھی وہ نوکری جانے کے ڈر سے احتجاجی مظاہروں میں شریک ہونے سے گھبراتی تھیں تب ہم ان کی ہمت بڑھاتے اور یہ بات " باس " تک پہچانے والے یہ خدمت انجام دے رہے تھے۔

پھر یہ ہوا کہ ادارے کے اندر دونوں گروہوں کے درمیان جھگڑا ہوا (ہم اس جھگڑے میں شامل نہیں تھے) جس کے نتیجے میں، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ادارے کے ڈسپلنری رولز کے مطابق سزا دی جاتی، 11 اساتذہ کے خلاف پولیس اسٹیشن پر کرمنل کیس کی FIR درج کرائی گئی جن میں تین خواتین تھیں (مجھ سمیت(۔

ہم پر افسر بالا کے دفتر پر نعرہ بازی کرتے ہوئے،۔ ہتھیاروں سے لیس ہو کر آفس میں توڑ پھوڑ مچانا اور افسر کی ٹیبل سے ان کا موبائل فون اور اہم دفتری فائلیں چرانے کے الزامات تھے، یعنی آفس میں ہنگامہ آرائی کرنے، ہتھیار لے کر آنے، چوری کرنے جیسے جرائم کی دفعات لگائی گئی تھیں اور افسر کے " چہیتے "اساتذہ کے نام گواہوں کے طور پر دیئے گئے تھے۔

ہمارے تو اوسان خطا ہو گئے تھے پولیس،۔ تھانے اور ایف آئی آر کا سن کر کے۔

"اس سے بہتر تھا کہ ہمیں نوکری سے نکال دیتے۔ اب تھانے اور کورٹ کے چکر لگیں گے اور ہمیں ضمانت کروانا پڑے گی۔ "

اور پھر یہی ہوا، صبح سے دوپہر تک اپنی کلاسز لیتے اور پھر کورٹ جاتے ضمانت کے لئے اور کبھی تھانے بلایا جاتا۔

ہم استاد تھے اور ایک تعلیمی ادارے سے وابستہ تھے، کرمنل نہیں تھے اس لئے اس صورتحال سے دکھ تو ہوا مگر ہم اتنے پریشان نہیں ہوئے کہ انسپیکٹر فریدی اور سارجنٹ حمید سے اور سوپر فیاض کو پہلے ہی سے جانتے تھے اس لئے پولیس والے ویسے ہی نکلے جیسے ابن صفی کے ناولوں میں پڑھے تھے۔ کبھی دوسری پارٹی سے پیسے لے کر ہمارے بیان بدل دیتے تو کبھی ہم سے پیسے لے کر" جائے واردات "اور" جرائم "کی خود ساختہ رپورٹ میں ٹھم چھوڑ دیتے۔

خیر جناب ایک طرف تو ہم کورٹ کی پیشیاں بھگت رہے تھے دوسری طرف سیکریٹری تعلیم اور وزیر تعلیم سے ملاقات کرتے۔

اس دوران ہم پر " افسرانہ عتاب " بھی نازل تھا۔ ہم سب لوگوں پر misconduct کا الزام لگا کر چارج شیٹ تھما دی گئی۔ ہم تو خود کو ابن صفی کے ناولوں کا کردار سمجھ رہے تھے دوسری طرف نوکری جانے کی اتنی پرواہ نہیں تھی مگر باقی لوگ اپنی اپنی فیملی کو سپورٹ کرتے تھے اس لئے اوپر تک اتنی دوڑ دھوپ کی، میڈیا میں بھی مسلسل معاملات کو کوریج مل رہی تھی، بالآخر وزیر تعلیم نے افسر کو عہدے سے فارغ کر دیا اس طرح اساتذہ کی نوکریاں تو بچ گئیں مگر ہم لوگوں کو چار سال تک کورٹ کی پیشیاں بھگتنی پڑیں۔

افسر کے جانے کے بعد جھوٹے گواہ بھی گھبرا گئے تھے سو ہمیں اس کیس سے " باعزت بری کیا گیا۔

اس جھنجھٹ سے نکلے ہی تھے کہ پتہ چلا کہ ادارہ دیوالیہ ہو چکا تھا اور اسٹاف کو دینے کے لئے تنخواہیں بھی نہیں تھیں۔ بس اب ادارے کو بچانے کی تحریک تھی اور ہم۔۔۔

حسب معمول فرنٹ لائن پر تھے۔

احتجاجی تحریک کے بعد کچھ فنڈ ملا اور ہمیں سانس لینے کا موقع ملا۔

اب جو نیا افسر آیا اس کی پہنچ تو بہت اوپر تک تھی۔ کچھ عرصہ نہ گذرا تھا کہ اس کے " جوہر " بھی سامنے آئے۔ بندہ عاشق مزاج تھا، حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ہمارے لڑائی بھڑائی کی شہرت کے بعد بھی اس کی نگاہ التفات ہم پر آ کر ٹھہری تو ہم توسٹ پٹا گئے کیوں کہ ہمیں اس معاملے کا ذرا بھی تجربہ نہیں تھا۔ ہم نے صاف الفاظ میں اسے سمجھایا مگر جب بندہ نشے میں ٹن ہو کر کال کرے تو پھر نصیحت بھول جاتا ہے۔ اب یہ سیدھا " حراس منٹ "کا معاملہ تھا اور یہ مسئلہ ورکنگ خواتین ہمیشہ سے بھگت رہی ہیں۔ عمران سیریز کی بااعتماد روشی ہو یا ایسی دوسری خواتین، ان کے باس ان کو حراساں کرتے تھے۔ ابن صفی نے ایسی لڑکیوں کی کہانیاں بھی بیان کی ہے جو یا تو مجبوری میں خود کو برباد کر دیتی ہیں یا پھر روشی کی طرح نوکری چھوڑ دیتی ہیں۔

اب جو ہم نے ابن صفی کے جاسوسی ناولوں سے سیکھا تھا، ہم نے موصوف کا ماضی معلوم کرنے کے لئے جاسوسی شروع کر دی اور ان لوگوں سے بات کی جو اس کے ساتھ کام کر چکے تھے، پتا چلا کہ وہ اسی مسئلے (خواتین کو حراساں کرنے) اور کرپشن کیس کی وجہ سے پچھلے ادارے نکالے گئے تھے اور اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ یہ سن کر ہم بوکھلا گئے اور پہلی مرتبہ خود کو مجبور محسوس کیا کہ اگر اسے ہماری طرف سے رسپانس نہ ملا تو انتقامی کاروائی کرتا اور ہمیں تنگ کرتا کہ آخر باس تھا، پاور تھا اس کے پاس اوپر سے سیاسی بیک بہت تگڑی تھی۔

اب لڑتے لڑتے ہم تھک گئے تھے اس لئے سوچا کہ اب بہتر ہے کہ جاب چھوڑ دی جائے مگر پھر سوچا کہ جاب چھوڑنے سے پہلے چھٹی پر چلی جاؤں اور اس دوران سوچنے کے لئے اور اس معاملے کے سلسلے میں کسی ایکسپرٹ سے رائے لوں کہ اس کا کوئی حل ہے کہ نہیں۔ پھر کوئی فیصلہ لوں۔

میں چھٹی پر تھی کہ ایک دن اسی ادارے میں کام کرنے والی ایک نوجوان اور خوبصورت ٹیچر میرے گھر پہنچ گئی اور پوچھا کہ میں چھٹی پر کیوں گئی تھی۔ میں نے ادارے میں اپنا مسئلہ کسی سے شیئر نہیں کیا تھا اس لئے پریشان ہوئی کہ اسے کیا بتاؤں کہ اچانک اس نے کہا:

"میں جانتی ہوں کہ آپ چھٹی پر کیوں گئی ہیں مگر آپ جیسی بہادر خاتون اس طرح پیچھے ہٹ جائے گی تو ہم جیسی مجبور لڑکیوں کا کیا ہو گا؟"

"کیا مطلب؟ "ہم نے چونک کر پوچھا۔

"میم! میں خود وہی مسئلہ فیس کر رہی ہوں جسے آپ فیس کر رہی ہیں۔ یعنی حراسمنٹ کا۔ کچھ اور خواتین بھی شکایت کر رہی ہیں مگر بہت خوفزدہ ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اب تک ہم لوگ ادارے کے مسائل کے حل کے لئے مل کر لڑ رہے تھے۔ یہ صرف خواتین کا مسئلہ ہے، مشترکہ مسئلہ نہیں ہے۔ کیا تم اور دوسری متاثرہ خواتین میرے ساتھ مل کر لڑیں گی؟"

"میں دوسری خواتین سے مل کر بتاؤں گی۔ آپ ہوں گی تو سب کو لڑنے کا حوصلہ ملے گا۔"

اس ملاقات نے ہمیں اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ سوچا کہ میں تو ابن صفی کے ناول پڑھ کر سوچتی تھی کہ میں بھی مجرموں سے لڑوں گی۔ ان کو قانون کے کٹہرے تک لاؤں گی مگر میں تو خاموش ہو کر گھر پر بیٹھ گئی ہوں۔ جب جاب چھوڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ڈرنا کیسا۔ جاب چھوڑنا بزدلی ہو گی البتہ لڑائی کے نتیجے میں نوکری سے نکالی جاؤں گی تو زیادہ بہتر ہو گا۔

بس جناب اب میں نے معلومات لینا شروع کی۔ اس وقت عمران اور فریدی کو بہت مس کیا کہ اگر وہ ہوتے تو ان سے مل کر مسئلہ بیان کرتی۔

بہر حال لوگوں سے کانٹیکٹ کر کے پتا کیا کہ شہر میں ایک "Women Complaint cell" کی آفس موجود ہے جو ڈی آئی جی کے ماتحت کام کرتی ہے۔ ہم نے وہاں شکایت درج کرائی۔ رسپانس بہت جلد ملا۔ ایک خاتون اے ایس پی ایک دو دن کے اندر ہی ادارے میں تفتیش کے لئے پہنچ گئی مگر ایک طرف باس نے لیڈی ٹیچرز تک دھمکی پہنچائی کہ کوئی بھی اس معاملے میں سامنے آئی تو نوکری سے جائے گی۔ دوسری طرف اوپر سے دباؤ ڈلوایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جن خاتون کے کہنے پر لڑنے کا فیصلہ کیا تھا وہ پیچھے ہٹ گئی اور دوسری لیڈی ٹیچرز بھی سامنے نہیں آئیں اور اس کمپلینٹ کو دبا دیا گیا۔ اب ہماری پوزیشن بہت خراب ہو گئی کہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا اب چھٹی ختم ہونے کے بعد یا تو استعفیٰ بھیج دوں یا پھر لڑوں۔ اس طرح یا تو غازی بن جاؤں گی یا پھر شہید۔ فیصلہ کر لیا کہ اکیلی لڑوں گی، کورٹ میں جاؤں گی کیونکہ 2010 میں Protection of Women against harassment at workplace کا آرڈیننس نافذ ہو چکا تھا جس کی عدالت سے بڑے بڑے افسروں کو سزائیں مل چکیں تھیں۔

کورٹ میں جانے کے بعد ایک طرف تو ہمیں مختلف Explanation Letters سے لے کر جاب سے نکالنے کی دھمکیاں بھی ملیں مگر ہماری محنت رنگ لائی اس افسر کے خلاف حراسمنٹ کیس کے ثابت ہونے پر دفتری کاروائی جاری تھی کہ ہمیں اور دوسری خواتین کو نوکری سے نکالنے کی دھمکیاں دینے والا نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے خلاف ثبوت ہم نے کیسے کیسے حاصل کیے اور کن کن مرحلوں سے گذرے، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ ادارہ تو وہ چھوڑ گیا (یہ موقع بھی اسے سزا سے بچانے کے لئے دیا گیا تھا کیونکہ اس نے جرم کیا تھا اور جرم کی سزا ہوتی ہے۔) کورٹ کے کیس کو جیتنے کے لئے آٹھ سال کی جدوجہد کی کہ اس شخص کو ایک دوسرا بڑا عہدہ دیا گیا۔ ہمارے کیس میں اسے بچانے کے لئے طاقتور سیاسی شخصیت مدد کر رہی تھی اور ہمیں مستقل ذہنی اذیت اور مالی بوجھ برداشت کرنا پڑا تھا مگر جیت بالآخر سچ کی ہوئی اور ہم کیس جیت گئے اور اپنی سروس مکمل کر کے ادارے باعزت رٹائر ہوئے۔

سوال یہ ہے کہ ہم نے اپنی کہانی کیوں لکھ دی؟ بات ہو رہی ہے ابن صفی کی اور ہم نے اپنا قصہ سنا ڈالا۔

تو جناب ابنِ صفی کے جاسوس ناول پڑھنے سے ہمارے اندر شعور پیدا ہوا، جرائم سے نفرت کی اور قانون کی بالادستی کو سمجھا۔ ثبوت کیسے جمع کرنے ہیں، گواہوں کو راضی کرنا، پولیس اور تھانوں کو فیس کرنا، مشکل وقت میں حوصلہ قائم رکھنا۔۔۔ یہ سب کچھ ہم نے ابن صفی کے جاسوسی ناولوں سے سیکھا۔۔۔

مطلب یہ کہ۔۔۔ اگر میں نے ابن صفی کو نہیں پڑھا ہوتا تو مجھ میں مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے لوگوں سے لڑنے کا حوصلہ نہ ہوتا۔

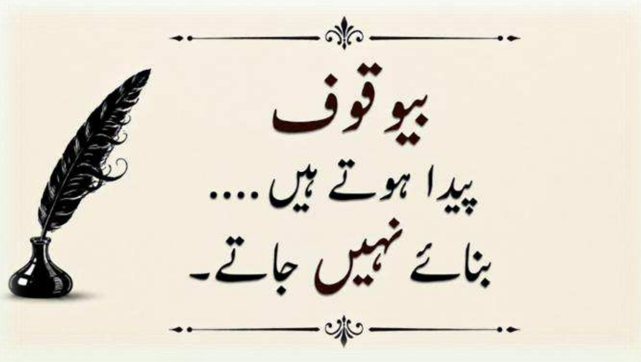

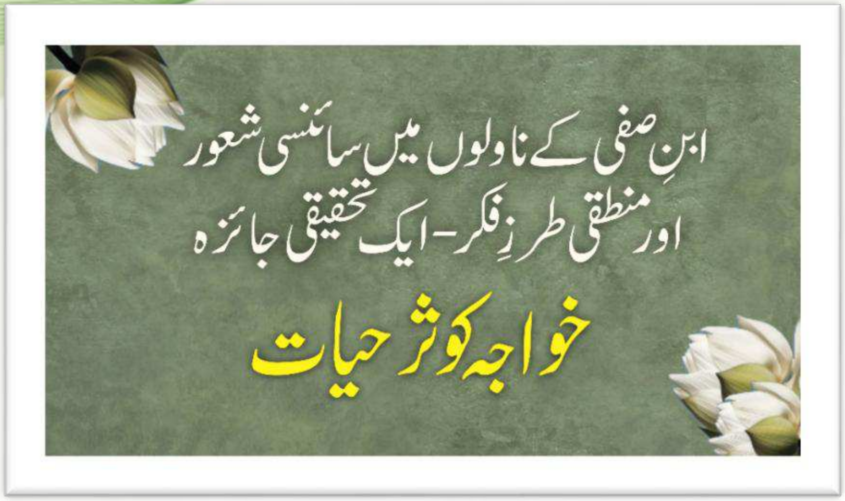

اردو ادب میں جاسوسی ناول نگاری کو ایک معتبر اور علمی مقام دلوانے کا سہرا بلاشبہ ابنِ صفی کے سر ہے۔ابن صفی نے جاسوسی ناول کو محض سنسنی خیزی اور تجسس کے روایتی حصار سے نکال کر اسے زباندانی، علمِ نفسیات، کیمیا، فزکس اور عمرانیات کا ایک ایسا دلچسپ امتزاج بنادیا جس نے قارئین کی ذہنی آبیاری کی۔ابنِ صفی کی تحاریر میں سائنسی سوچ محض معلومات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک ایسا طرزِ زندگی ہے جو انسانی ذہن کو توہم پرستی کے اندھیروں سے نکال کر مشاہدے اور منطق کی روشنی کی طرف لے جاتا ہے۔

کردار نگاری اور سائنسی علامتیں۔

ابنِ صفی نے اپنے دو شاہکار کرداروں، علی عمران اور کرنل فریدی کے ذریعے دو مختلف لیکن مضبوط سائنسی رویوں کو متعارف کروایا۔

علی عمران:

عمران سیریز کا مرکزی کردار علی عمران جو اپنی ظاہری حرکات سے لاابالی معلوم ہوتا ہے، دراصل ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں رکھنے والا ایک باعمل انسان ہے۔

عمران کا کام کرنے کا طریقہ کار سائنسی طریقہ تحقیق (Scientific Method) کے عین مطابق ہے۔وہ پہلے مفروضے (Hypothesis) قائم کرتا ہے اور پھر حالات و واقعات کی چھلنی سے گزار کر انہیں حقیقت کے قریب لاتا ہے۔ وہ دشمن کے خلاف صرف اسلحہ نہیں بلکہ نفسیاتی علوم کا استعمال کرتا ہے جو انسانی دماغ کے میکانزم کی گہری سمجھ بوجھ کا مرہونِ منت ہے۔

کرنل فریدی : مشاہدہ اور استخراج:

کرنل فریدی کا کردار باوقار، اصولی، سنجیدگی اور گہرے سائنسی مطالعے کا نمونہ ہے۔اردو ادب کا پہلا جاسوس ہے جس نے سائنسی تحقیقات کے لیے اپنی ذاتی لیبارٹری (فارنسک لیبارٹری) قائم کی۔وہ جائے وقوعہ سے ملنے والے خون کے دھبوں، مٹی کے ذرات اور کیمیائی اجزاء کا تجزیہ کر کے مجرم تک پہنچتا ہے۔

فریدی کے نزدیک کائنات کا کوئی بھی واقعہ " مافوق الفطرت "نہیں ہوتا۔اس نے ہمیشہ جادو ٹونے اور طلسماتی دعووں کو مادی شواہد اور سائنسی منطق سے شکست دی۔

ابنِ صفی کی سائنسی بصیرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے دہائیوں پہلے اپنے ناولوں میں ایسی ٹیکنالوجیز کا ذکر کیا جو اس وقت محض تخیل تھیں لیکن آج حقیقت بن چکی ہیں۔

وائس چینجر اور لسننگ ڈیوائسز:ناول" چٹانوں کا راز "میں آواز کی فریکوئنسی بدلنے والے آلات کا ذکر ملتا ہے۔

اسٹیلتھ ٹیکنالوجی:ناول" دھوئیں کا حصار " میں ایک ایسے جزیرے کا تصور پیش کیا گیا جو ریڈار کی گرفت میں نہیں آتا جو کہ جدید اسٹیلتھ ٹیکنالوجی کی ابتدائی شکل ہے۔

خفیہ طریقۂ کام" : موت کی آندھی " جیسے ناولوں میں الٹرا وائلٹ شعاعوں اور مخصوص کیمیائی محلول کے ذریعے مخفی تحریروں کو ظاہر کرنے کا طریقہ بیان کیا گیا۔

ابن صفی کے ناولوں میں سائنسی سوچ محض دعووں تک محدود نہیں ہے، بلکہ انہوں نے باقاعدہ ایسے واقعات اور آلات کا ذکر کیا ہے جو ان کی سائنسی بصیرت کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہاں کچھ اہم حوالے اور مثالیں پیش ہیں؛

۱ . لیبارٹری اور کیمیائی تجزیہ (ناول " خطرناک لاش ")

جاسوسی دنیا کے ابتدائی ناولوں میں ہی ہمیں کرنل فریدی کی لیبارٹری کا ذکر ملتا ہے۔ ایک موقع پر جب ایک ایسی لاش ملتی ہے جس کے جسم پر کوئی ظاہری زخم نہیں ہوتا، تو فریدی جذباتی ہونے یا اسے جادو قرار دینے کے بجائے اس کا پوسٹ مارٹم اور کیمیائی تجزیہ کرتا ہے۔ وہ زہر کی ایسی قسم دریافت کرتا ہے جو خون میں مل کر اپنی شناخت مٹا دیتی ہے، مگر فریدی مخصوص ری ایجنٹس (Reagents) کے ذریعے اسے ثابت کر دیتا ہے۔

۲ . آواز بدلنے والا آلہ (ناول " چٹانوں کا راز ")

علی عمران نے کئی ناولوں میں ایسے آلات کا استعمال کیا جو اس کی آواز کی فریکوئنسی بدل دیتے تھے۔ " چٹانوں کا راز " میں وہ دشمن کو دھوکہ دینے کے لیے سائنسی آلات کا سہارا لیتا ہے۔ یہ اس دور میں لکھا گیا تھا جب " وائس چینجر (Voice Changer) " عام نہیں تھے، مگر ابن صفی نے اسے سائنسی بنیادوں پر پیش کیا۔

۳ . ہپناٹزم اور نفسیات (ناول " پاگلوں کی انجمن ")

اس ناول میں ابن صفی نے دکھایا ہے کہ کس طرح انسانی ذہن کو مخصوص لہروں یا نفسیاتی دباؤ کے ذریعے کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ یہاں وہ جادو کے بجائے نفسیاتی سائنس کا سہارا لیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انسانی لاشعور کس طرح کام کرتا ہے۔

۴ . مصنوعی جزیرہ اور جدید ٹیکنالوجی (ناول " دھوئیں کا حصار ")

عمران سیریز کے اس ناول میں ایک ایسے دشمن کا ذکر ہے جس نے سمندر کے بیچ ایک ایسا اڈہ بنا رکھا ہے جو ریڈار کی زد میں نہیں آتا۔ ابن صفی نے یہاں اسٹیلتھ ٹیکنالوجی (Stealth Technology) اور زیرِ آب مواصلات کا جو تصور پیش کیا، وہ اس زمانے کے لحاظ سے بہت آگے کی سائنسی سوچ تھی۔

۵ . مائیکرو فلم اور خفیہ پیغامات (ناول " : موت کی آندھی ")

جاسوسی دنیا کے کئی ناولوں میں فریدی ایسے کیمیکلز کا استعمال کرتا ہے جو بظاہر سادہ کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر کو مخصوص روشنی (جیسے الٹرا وائلٹ شعاعیں) یا کسی خاص محلول کے ذریعے ظاہر کر دیتے ہیں۔ یہ " سائنس آف انک (Science of Inks) " کا بہترین استعمال تھا۔

٦ . منطقی استدلال (ناول " سائے کا قتل ")

جب لوگ ایک " سائے " کے ہاتھوں قتل ہونے پر اسے بھوت پریت کا کام سمجھ رہے تھے، تو فریدی نے سائنسی مشاہدے سے ثابت کیا کہ یہ ایک خاص قسم کا عکس (Projection) ہے اور قاتل دراصل ایک سائنسی تکنیک استعمال کر رہا ہے۔

نتیجہ :

ابن صفی کے ناولوں کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خرافات اور توہم پرستی کا مقابلہ ہمیشہ مشاہدے، تجربے اور منطق سے کیا۔ ان کے ہاں " میڈیکل جیورس پروڈنس " اور " فارنسک سائنس " کے ابتدائی نقش بہت واضح نظر آتے ہیں۔

ابنِ صفی کے ناولوں میں سائنس کا مقصد محض طاقت کا حصول نہیں بلکہ انسانیت کی خدمت ہے۔ ان کی تحریروں میں خیر اور شر کا مقابلہ اکثر سائنسی بنیادوں پر ہوتا ہے۔

تھریسیا یا ڈاکٹر ڈریگو جیسے کردار سائنسی علم کو تخریب اور دنیا پر قبضے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اسی طرح عمران اور فریدی اسی علم کو ڈھال بنا کر جرائم کا خاتمہ کرتے ہیں جو یہ پیغام دیتا ہے کہ علم بذاتِ خود برا نہیں، اس کا استعمال اسے اچھا یا برا بناتا ہے۔

مختصر یہ کہ ابنِ صفی نے اردو دان طبقے کو صرف تفریح فراہم نہیں کی بلکہ انہیں ایک " سائنسی مزاج "عطا کیا۔ ان کی تحریروں نے قارئین کو یہ سکھایا کہ معجزوں کے انتظار میں بیٹھنے یا حالات سے گھبرانے کی بجائے، عقل اور مشاہدے کو بروئے کار لا کر ہر معمے کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ابنِ صفی کا فن آج بھی اس لیے تازہ ہے کیونکہ اس کی بنیاد ٹھوس حقائق، منطقی استدلال اور انسانی نفسیات کی گہری تفہیم پر قائم ہے۔

ابنِ صفی بلاشبہ اردو کے ایسے قلمکار ہے جنہوں نے جاسوسی ادب کے ذریعے سائنسی شعور کو عوامی سطح پر متعارف کروا کر اسے ایک علمی وقار عطا کیا۔

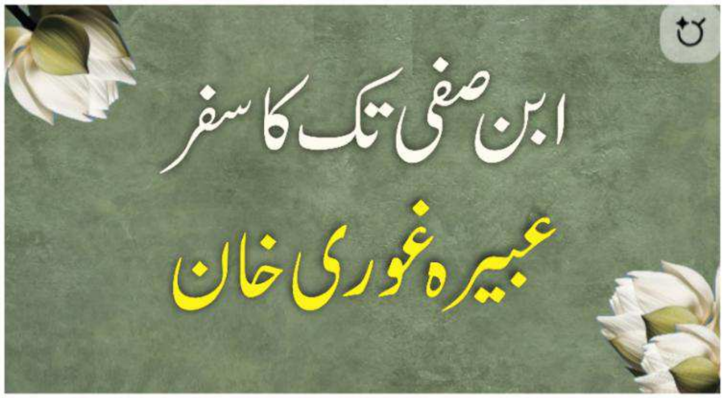

عمران سیریز سے واقفیت کی یہ داستان شروع ہوتی ہے جب ہم میٹرک میں تھے۔

سینٹر کے راستے میں پڑنے والی لائبریری سے روز ناولیں اور کتابیں لینے کا معمول تھا۔ جن کی لائبریری تھی وہ باباجان کے دوست تھے تو لائبریری میں ان کی عدم موجودگی میں بھی ہمیں کتابیں اٹھالانے کی اجازت تھی۔۔۔ اور اس دن بھی یہی ہوا تھا۔ پڑھی ہوئی کتابیں کاؤنٹر پر رکھ کر ہم انکل کا انتظار کر رہے تھے وہ نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ اچانک کاؤنٹر کے ایک سائیڈ پر نظر پڑی جہاں کچھ مجلد ناول موجود تھے۔ کھول کر دیکھا تو کوئی عمران سیریز تھی، مصنف کا نام تھا مظہر کلیم۔۔۔ خیر ہم وہ ناول گھر لے گئے اور اگلے کچھ ہی دن میں لائبریری میں موجود عمران سیریز کے تمام ناول پڑھ ڈالے۔ سارے ناول پڑھنے کے باوجود بہت سی باتیں ذہن میں صاف نہیں ہوئیں۔۔۔ کئی سوالات پیدا ہوئے جو انکل سے پوچھے تو پتا چلا کہ عمران سیریز کے حقیقی مصنف " ابن صفی " ہیں لیکن ابن صفی کے ناول ان کے پاس دستیاب نہیں تھے۔۔۔

پھر کچھ وقت بعد ہاتھ میں آیا سمارٹ فون۔۔۔ ایک دن یونہی فارغ بیٹھے فیس بک سرچ بار میں " عمران سیریز " لکھا تو کئی گروپ نظر آئے جن میں سے دو ایک ہم نے جوائن کر لیے۔ سالوں پہلے ذہن میں پیدا ہونے والے سوال وہاں گروپ میں پوچھے، کچھ مزاحیہ تو کچھ سنجیدگی کے پیرائے میں۔۔۔ پھر غالباً جولیانا سے متعلق پوسٹ کی تھی کہ جولیا کو ڈپٹی چیف کس ناول میں بنایا گیا؟ تو شاید اسی پوسٹ کے کمنٹس میں ہمیں کسی نے ابن صفی کی عمران سیریز پڑھنے کا مشورہ دیا۔ ہم نے اسی دن ڈاؤنلوڈ کی اور پڑھنا شروع کر ڈالی۔۔۔۔ باتیں صاف ہوتی گئیں اور سوالوں کے جوابات ملتے گئے مگر نقل پڑھنے والوں کے لئے اصل ہضم کرنا تھوڑا مشکل تھا تو کچھ وقت کے لئے ہم نے پڑھنا چھوڑ دیا۔۔۔ پھر کچھ وقت بعد جاسوسی دنیا کا نام سننے میں آیا کہ ابن صفی کی " فریدی سیریز " بھی ہے جستجو پیدا ہوئی اور اس بارے میں تمام معلومات ابن صفی کے ایک ڈائی ہارڈ فین سے ملیں۔

پھر " دلیر مجرم " سے شروع کیا جانے والا یہ سفر خاصی رفتار سے جاری رہا۔۔۔۔ روز دو سے تین ناول ہضم کرنا اور رات کو ان ناول پر گروپ میں تبصرہ کرنا دلچسپ لگتا تھا۔

جاسوسی دنیا مکمل کرنے کے بعد عمران سیریز بھی پڑھی اور تاحال کئی بار دونوں سیریز پڑھ چکی ہیں۔

مطالعے کے دوران ہی " صفیانوں "(ابن صفی فینز خود کو صفیانے کہتے ہیں) کی جانب سے ہی ابن صفی کے کرداروں کے خاکے جمع کرنے کا مشورہ ملا تو دونوں سیریز سے ناولوں ہی کے اقتباسات کی مدد سے کردار نگاری کا کام مکمل کیا اور اس کے بعد دونوں سیریز سے ابن صفی کے اقوال بھی جمع کئے۔

ابن صفی کی پرستار کے طور پر یہ دونوں کام کر کے ہمیں فخر محسوس ہوتا ہے۔

جہاں تک بات ہے پسندیدہ کردار کی تو کرنل احمد کمال فریدی ہمارا پسندیدہ کردار ہے۔ اس کے علاوہ نیلم۔۔۔ اور عمران سیریز میں سے عمران، صفدر اور طاہر۔۔۔ کرداروں نے تو ہماری ذاتی زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈالا البتہ ابن صفی کے اقوال بہت سے مقامات پر بہترین معاون ثابت ہوئے۔

ابن صفی کے ناولوں سے کردار نگاری کا کام اسی سال مکمل ہوا۔۔۔ پیش ہیں کچھ ایسے کرداروں کے خاکے جو منفی ہونے کے باوجود ذہن پر گہری چھاپ چھوڑ جاتے ہیں اور دل میں کہیں نہ کہیں ان کے لئے ہمدردی ضرور محسوس ہوتی ہے۔

"مسٹر کیو "۔۔" ڈاکٹر نارنگ"

ڈاکٹر نارنگ نہ صرف اس شہر بلکہ پورے ملک کے مشہور ترین آدمیوں میں سے تھا۔ نہ صرف اعلیٰ حکام بلکہ وزراء تک اس کا احترام کرتے تھے۔ ڈاکٹر نارنگ دوہرے بدن کا ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان میں رہی ہو گی لیکن صحت مند ہونے کی بنا پر یہ کہنا دشوار تھا کہ وہ بڑھاپے کی سرحدوں میں قدم رکھ چکا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ گفتگو کرنے کا عادی تھا اور دورانِ گفتگو اپنی نظریں مخاطب کے چہرے سے ہٹائے رکھتا تھا اس کے متعلق مشہور تھا کہ اس کبھی کسی سے کرخت آواز میں گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا گیا۔

جھاڑیاں سنسان پڑی تھیں البتہ ان میں بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں چند لمحے ادھر ادھر دیکھتے رہے پھر راجن کی طرف لوٹ آئے جو ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

انہوں نے کار میں پچھلا حصہ کھول کر پیٹرول کے تین کنستر نکالے اور انہیں لاش پر خالی کرنے لگے۔

"نہ جانے کون تھا۔؟ "ناگر کے ساتھ والے نے کہا۔

"مسٹر کیو (Q) کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔"

"مسٹر کیو!؟ "دوسرا کپکپاتی آواز میں بولا" آخر یہ مسٹر کیو ہے کون؟"۔

"کام کرو کام "ناگر نے مضطربانہ انداز میں کہا" کہیں تمھاری کھوپڑی میں بھی چھٹانک بھر سیسہ نہ اتر جائے۔"

"یار میں تنگ آ گیا ہوں۔۔۔ اس کام سے۔ "دوسرا بولا۔

"معلوم ہوتا ہے۔۔۔ سچ مچ۔۔۔ موت منڈلا رہی ہے تمھارے سر پر۔"

پیٹرول ڈال دینے کے بعد وہ لاش سے دور ہٹ گئے پھر ناگر نے ایک دیا سلائی سلگا کر لاش کی طرف اچھال دی دوسرے ہی لمحے وہاں آگ ہی آگ تھی۔ واپسی پر انہیں کار میں ایک پرچہ ملا جس پر تحریر تھا "اپنے کام سے کام رکھو اور حکم کی تعمیل کرو مسٹر کیو کے بارے میں کچھ کہنا موت کو دعوت دینا ہے۔"

نارنگ قیدیوں کے کپڑے پہنے ہوئے کٹہرے میں بیٹھا تھا لیکن یہ بڑی عجیب بات تھی کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ تندرست نظر آ رہا تھا چہرہ سرخ اور آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک نظر آ رہی تھی۔ جب وہ اپنا بیان دینے کے لئے کھڑا ہوا تو عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ پھر حلف دینے کی رسم شروع ہونے والی تھی کہ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا "کسی موہوم ہستی کو درمیان میں لانے کی ضرورت نہیں ہے میں جو کچھ بھی کہوں گا سچ ہی کہوں گا۔ البتہ میں بہتے ہوئے خون کی قسم کھا سکتا ہوں کیونکہ خونریزی ہی میرا مذہب رہا ہے۔ لوگ میرے جرائم کا مقصد جاننے کے لئے بے تاب ہیں میں کہتا ہوں جو مقصد کسی مذہب کا ہو سکتا ہے وہی میری خونریزی کا بھی تھا۔ مذہب انفرادی اور اجتماعی سکون کا ذریعہ ہے جبکہ میں صرف انفرادیت میں یقین رکھتا ہوں محض اس لئے کہ اجتماعی زندگی نے مجھے حرامی قرار دیا تھا۔

ڈاکٹر نارنگ کی پھانسی کا منظر بھی عجیب تھا جن لوگوں نے اسے اس وقت دیکھا ان کا بیان ہے کہ وہ گوشت پوست کا آدمی تو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا اس کے چہرے پر خوف یا اضمحلال کی جگہ شگفتگی تھی۔ جب اس سے اس کی آخری خواہش پوچھی گئی تو وہ مسکرا کر بولا " پوچھنے سے کیا فائدہ جبکہ پوری ہی نہ کی جا سکے۔ میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ جتنے بھی موجود ہیں انہیں بڑی بے دردی سے قتل کر دوں۔ آخری خواہش پوچھنے کا ڈھکوسلہ بھی عجیب ہے۔ اچھا خیر چلو۔۔۔ اگر پوچھنا ہی ہے تو ایک بڑی معمولی سی خواہش پوری کر دو۔ میرے مرنے سے پہلے یہی کہہ دو کہ ڈاکٹر نارنگ حرامی نہیں ہے۔

وہ تھوڑی دیر تک خاموشی سے کھڑا اس مجمعے کو دیکھتا رہا جسے گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ پھر اس نے ایک زہریلا سا قہقہہ لگایا اور بلا تکان پھانسی کے تختے پر چڑھ گیا۔

جاسوسی دنیا ناول نمبر 29۔ لاشوں کا آبشار

علامہ دہشت ناک

گیارہ افراد ایک قطار میں دوڑے چلے جا رہے تھے اس طرح کہ ایک کے پیچھے ایک تھا اور یہ لمبی سی قطار کہیں سے بھی ٹیڑھی دکھائی نہیں دیتی تھی اس قطار میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔۔۔

سب سے آگے ایک قد آور جسیم آدمی تھا عمر چالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہو گی اور چہرہ داڑھی مونچھوں سے بے نیاز البتہ سر پر گھنے اور لمبے لمبے بال لہرا رہے تھے آنکھوں میں بے پناہ توانائی ظاہر ہوتی تھی۔

"ہالٹ۔۔۔ "!قد آور آدمی نے زور سے کہا اور وہ سب رک گئے

"ڈیس پریس۔ "!!!!!قد آور آدمی کی آواز پھر بلند ہوئی اور وہ سب تتر بتر ہو کر گھاس میں بیٹھ گئے سبھی گہرے گہرے سانس لے رہے تھے۔ قد آور آدمی جہاں تھا وہیں کھڑا رہا اس کی ظاہری حالت سے کوئی تبدیلی نہیں دکھائی دیتی تھی سب کچھ معمول کے مطابق تھا نہ چہرے پر تھکن کے آثار تھے نہ سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا قطعی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے بھی یہ مسافت دوسروں کی طرح دوڑتے ہوئے ہی طے کی ہے۔

آدھے منٹ سے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اس نے " فال ان " کی ہانک لگائی اور وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے اور تیزی سے قطار بنالی۔

"ایٹ ایز " کہہ کر اس نے ان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور بولا " دوستو۔۔۔! طاقت کا سرچشمہ۔"

"ذہانت۔۔۔ "!سب بیک آواز بولے

"کیڑے مکوڑے۔۔۔۔ "!وہ پھر دہاڑا

"غیر ذہین دوپائے۔ "انہوں نے ہم آواز ہو کر کہا

"اور یہ کیڑے مکوڑے ذہین آدمیوں کے آلہ کار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔۔۔۔ انہیں استعمال کرو اور صرف اتنا ہی انہیں تیل دو کہ متحرک رہ سکیں۔۔۔۔ اگر ان میں سے کوئی ناکارہ ہو جائے تو اسے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دو اور اس کی جگہ دوسرا پرزہ فٹ کر دو۔۔۔۔ انہیں قابو میں رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ حقارت سے دیکھا جائے۔۔۔ اگر تم نے انہیں آدمی سمجھا تو یہ خود کو اہمیت دینے لگیں گے۔۔۔ اور پھر تم انہیں اپنے قابو میں نہ رکھ سکو گے۔ "

وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ سامنے دس افراد سر جھکائے کھڑے تھے اور ان کی آنکھوں میں اس کے لئے بے اندازہ احترام پایا جاتا تھا۔

یہ سب علامہ دہشت کے مخصوص شاگرد تھے یعنی اس کے نظریات سے اتفاق رکھتے تھے وہ نظریات جن کا اظہار وہ سب کے سامنے نہیں کرتا تھا ویسے پڑھے لکھے حلقوں میں خاصی بڑی پوزیشن رکھتا تھا لوگ اس کی علمیت سے مرعوب ہو جاتے تھے۔ یونیورسٹی میں ذہنی دیو کہلاتا تھا اچھا شاعر اور اچھا نقاد بھی تھا آئے دن اس کی قیام گاہ پر بزم شعر و سخن کا اہتمام ہوتا رہتا تھا۔

بعض بے تکلف احباب کبھی کبھی کہہ بیٹھتے کہ سوشیالوجی کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کو تو دہشت ناک نہ ہونا چاہیئے لہٰذا اسے تخلص بدل لینا چاہئے کوئی فرق نہ پڑے گا وہ ہنس کر کہتا " کتنے ہی تخلص بدل لوں کہلاؤں گا دہشت ہی۔"!

علامہ کی شخصیت بے حد پر کشش تھی اور اس کی ساری باتیں عام ڈگر سے ہٹ کر ہوتی تھیں۔ ہر معاملے میں اس کا نظریہ عام نظریے سے مختلف ہوتا تھا اور اپنی قوت استدلال سے کام لیکر وہ دوسروں کو اس کے متعلق مطمئن بھی کر دیتا تھا پہلے پہل لوگ اس کے طرز تقریر کے جال میں پھنستے تھے۔۔۔ پھر آہستہ آہستہ اس طرح گرویدہ ہوتے چلے جاتے تھے جیسے وہ پیغمبرانہ انداز میں ان کے درمیان آیا ہو۔۔۔ ان میں کچھ انتہائی درجے کے جاں نثار ہوتے تھے اور انہی جاں نثاروں کو خاص شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہو جاتا تھا

بہر حال ان مخصوص شاگردوں کو وہ ہر طرح کی تربیت دیتا تھا۔

علامہ سے آنکھیں ملا کر گفتگو کرنا بھی آسان نہیں تھا۔۔۔ مقابل کی زبان لڑکھڑا جاتی تھی اور اگلا جملہ ذہن سے محو ہو جاتا تھا اس سے پوری بات اسی طرح کی جا سکتی تھی کہ اس کی آنکھوں میں نہ دیکھا جائے۔

"علامہ دہشت ناک"

دوپہر کو رحمان صاحب کے طلب کرنے پر وہ ان کے آفس پہنچا تھا۔ انہوں نے اطلاع دی کہ علامہ یا تو بن رہا ہے یا سچ مچ پاگل ہو گیا ہے م۔حکمے ہی کی حوالات میں اسے رکھا گیا تھا۔

فیاض کے ساتھ وہ حوالات کی طرف روانہ ہوا تھا۔

" عجیب چیز ہے یہ علامہ بھی بالکل کسی پانچ یا چھ سال کے سے بچے کی آواز میں چیختا رہتا ہے ۔ "فیاض نے کہا

عمران چلتے چلتے رک گیا دفعتاً اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔

"یقین کرو۔۔۔ وہ علامہ کی پاٹ دار آواز نہیں ہے کسی بچے کی آواز ہے۔ "فیاض بولا

عمران نے تیزی سے حوالات کی طرف قدم بڑھائے تھے ذہن میں آندھیاں اٹھ رہی تھیں اور پہلی بار احساس ہوا تھا کہ وہ کیا کر بیٹھا ہے اس دوران میں وہ صرف فیاض کی آواز سنتا رہا تھا اس کا دھیان نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔

حوالات کے کٹہرے کے قریب پہنچ پر اس نے علامہ کو زمین پر اوندھے پڑے دیکھا اس نے اسے آواز دی تھی۔

علامہ نے اسے سر اٹھا کر دیکھا تھا لیکن اس کی انکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی بھی جھلک نہ دکھائی دی ان میں ایسی ہی لاتعلقی پائی جاتی تھی جیسے کسی چوپائے نے آنکھ اٹھا کر انہیں دیکھ لیا ہو۔

پھر اچانک وہ چیخنے لگا تھا" ماں۔۔۔ماں۔۔۔بابا۔۔۔بابا۔۔۔میرے بابا۔۔۔ "!آواز سچ مچ کسی پانچ چھ سال کے بچے کی سی تھی۔

"کمال کی آواز بدلتا ہے۔ "فیاض ہنس کر بولا

عمران کچھ نا بولا اس کا تالو خشک ہوا جا رہا تھا حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے تھے۔

علامہ پھر اسی انداز میں ماں اور بابا کو پکارنے لگا اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

"چلو۔۔ " ! عمران واپسی کے لئے مڑتا ہوا بولا

فیاض اسے حیرت سے دیکھتا ہوا اس کے پیچھے چلنے لگا باہر نکل کر عمران بولا تھا " یہ بن نہیں رہا ذہنی طور پر ماضی میں لوٹ گیا ہے بعض صدمے ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"کہاں کی ہانک رہے ہو۔؟"

"تم کچھ نہیں جانتے علامہ کی پچھلی زندگی کے بارے میں۔"

"بہت زیادہ سنجیدہ ہو رہے ہو۔"

"ہم سب درندے ہیں مائی ڈیئر فیاض۔۔۔ سب کچھ سامنے آجائے گا باقاعدہ پوری رپورٹ تیار کر کے تمہارے حوالے کروں گا جسے عدالت میں پیش کر سکو گے لیکن اس شخص کے لئے میرا دل رو رہا ہے۔۔۔ کاش اس کے انتقامی جذبے نے انفرادی رنگ اختیار کرنے کی بجائے ایسی تحریکوں کا ساتھ دیا ہوتا جو ظلم اور جبر کے نظام کو مٹا دینے کے لئے کام کر رہی ہیں۔"!

"کہیں میں بیہوش نہ ہو جاؤں تمہیں سنجیدہ دیکھ کر۔۔۔ "!فیاض کھوکھلی سی ہنسی کے ساتھ بولا تھا۔

عمران کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے اور وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔

-

"بیچارہ شہزور"

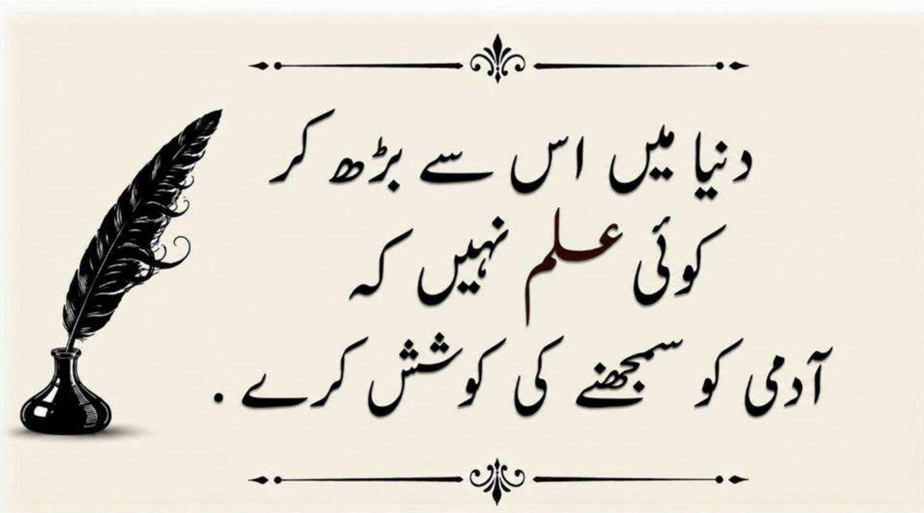

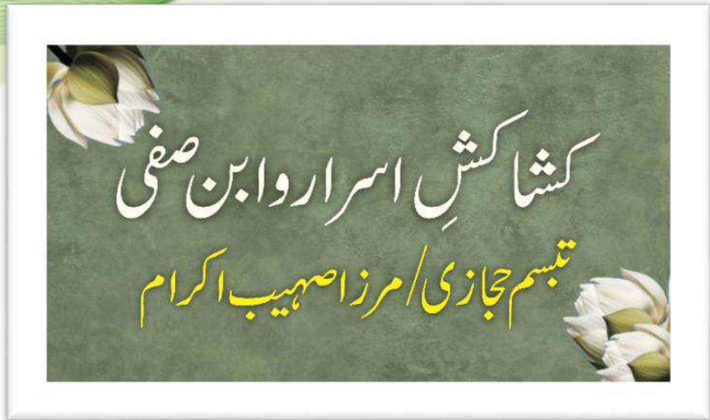

کچھ انسان ایسی خداداد صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں کہ انھیں دیکھ کر یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ایک ہی انسان اتنا ہمہ جہت کیسے ہو سکتا ہے۔ ابن صفی ایک ایسی ہی شخصیت کا نام ہے۔ اردو ادب میں بے شمار ایسے نام گزرے ہیں جو اپنے فن میں ید طولی رکھتے تھے۔ انہی عظیم شخصیات میں ایک نام اسرار احمد کا ہے۔ جنھیں ایک زمانہ ابن صفی کے نام سے جانتا ہے۔ ان کے چاہنے والے انھیں طغرل فرغان اور اسرار ناروی کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔

ابن صفی نے شہرت اور مقبولیت کی جس بلندی کو چھوا وہ اردو ادب کے کسی اور مصنف کے حصہ میں نہیں آئی۔ لیکن کیا بطور جاسوسی مصنف اس مقام تک پہنچنا ہی ابن صفی کی زندگی کا حاصل تھا یا وہ زندگی میں کچھ اور کرنا چاہتے تھے ؟ اس سوال کا حتمی جواب تو ملنا ممکن نہیں لیکن کچھ حد تک جواب ان کی تحریروں میں کہیں نہ کہیں چھپا نظر آتا ہے کہ ابن صفی کے اندر موجود اسرار ناروی کس طرح اپنا وجود منوانے کے لئے بے چین رہے۔۔

میکسم گورکی کہتا ہے " اگر آپ کا کام وہ ہے جو آپ کرنا چاہتے ہیں تو زندگی جنت ہے ورنہ غلامی ہے "۔۔ ابن صفی بھی شاید اندر ہی اندر اس رسہ کشی کا شکار رہے کہ وہ کریں جو دل چاہتا ہے یا وہ کام جو وجہ شہرت اور ذریعہ معاش بھی ہے۔

اسرار ناروی ایک بھرپور شاعر تھے اور ابن صفی ایک مکمل جاسوسی ناول نگار تھے۔ اسرار احمد مینا و بلبل اور گل و گلزار کے فسانے لکھا کرتے تھے۔ ابن صفی پر اسراریت اور سراغ رسانی کو اپنا بنا رہے تھے۔ اسرار احمد شاعری میں نظم و غزل میں کھوئے ہوئے تھے لیکن ابن صفی دور کسی محفل میں عریانیت اور فحش نگاری کے خلاف بند باندھنے کا اعلان کر رہے تھے۔ اسرار احمد قافیہ و ردیف، معنی و مطالب اور خیال و خواب میں ڈوب کر اپنے لطف کا سامان اور شوق کی تکمیل کر رہے تھے۔ جبکہ ابن صفی کے دل و دماغ میں ان کے شاندار کردار، لازوال کہانیاں، مکالمے اور مناظر خیال سے حقیقت کا روپ دھارنے کو بے چین تھے۔

ایک طرف غزل خواں تھا دوسری جانب کہانی کار۔ دونوں میں ٹھنی تھی۔ غزل کے میدان میں اسرار احمد کے سامنے غالب و میر جیسے نمونے تھے لیکن اسے اپنی قوتِ گفتار پر یقین تھا۔ دوسری جانب ابن صفی کے سامنے کوئی نمونہ نہیں تھا۔ اردو زبان و بیان میں جاسوسی ادب کے نام سے کوئی آشنا نہیں تھا۔

اسرار احمد کے کندھوں پر نوح ناروی کی وراثت تھی اور ابن صفی کے سامنے ایک گہرا اندھیرا۔

ایک طرف سجا سجایا بازار تھا لیکن نئے خیال کو لانا امتحان تھا تو دوسری جانب سرے سے محفل ہی نہیں تھی۔ اسرار احمد اپنی دھن کا پکا تھا اور ابن صفی اپنے قول کا۔

مقابلہ قول و اقرار کا ٹھہرا تو اسرار ناروی نے ابن صفی کے سامنے وقتی ہار مانی کیونکہ ابن صفی نے بھری محفل میں راز افشاں کیا تھا اور دعویٰ کر بیٹھے کہ وہ اردو ادب میں جاسوسی کی داغ بیل ڈالیں گے لیکن یہ سب اتنا سادہ سیدھا اور سہل نہیں ہے ان دونوں کی آپسی مخالفت اور مخاصمت کی پوری ایک تاریخ ہے۔

اسرار احمد اپریل 1928 کو نذیرابی بی اور صفی اللہ کے آنگن میں مہکے۔ان کی فیملی کائستھ نژاد مسلم تھی۔ان کے اجدادراجاوشیشر دیال سنگھ نے اسلام قبول کیاتوان کا خاندان مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ابن صفی کے والد بوجہ ملازمت نارہ سے الہ آباد آئے اور وزیر علی انڈسٹریز میں ملازم بھرتی ہوئے۔جو قیام پاکستان کے بعد بھی یہاں کام کرتی رہی۔مشہور گھی تلو یہی لوگ بنایا کرتے تھے۔بعد میں اس کمپنی کی اسپن آف علی آٹوز نکلی جو سوزوکی کو پاکستان میں لائی اور پھر سوزوکی ہی نے اسے خرید لیا۔اور وزیر علی انڈسٹریز کو لیور برادرز نگل گئے۔

ان کی والدہ نذیرابی بی بہت تعلیم یافتہ خاندان سے تھیں جو حکیموں کا خاندان کہلاتا تھا۔انہوں نے اسرار احمد کی ابتدائی تعلیم وتربیت پر بہت توجہ دی۔اسرار احمد کے کئی بہن بھائی تھے۔اسرار احمد نے اپنی ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں حاصل کی۔۔ سات سال کی عمر میں پڑھی طلسم ہوش ربا نے ان کے ذہن پر بہت اثر کیا اور ساتویں جماعت سے نثر لکھنا شروع کی اور آٹھویں جماعت میں پہلی نظم لکھی۔۔ابتدائی دور میں وہ جگر مراد آبادی سے متاثر تھے۔سیکنڈری تعلیم الہ آباد میں حاصل کی اور ڈی اے وی اسکول سے میٹرک کیا۔اسی دور میں اشتراکیت سے متاثر ہو کر بھی کچھ شاعری کی. اسرار احمد نے ہائی اسکول کی تعلیم الہ آباد کے ایونگ کرسچین کالج سے حاصل کی۔یہاں اسرار احمد کی شاعری کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا وہ اکثر ہوسٹل کے مشاعروں میں اپنا کلام سنانے لگے۔کالج کے پہلے سال تک پبلک میں پڑھنے سے ہچکچاتے رہے لیکن دوسرے سال وہ لٹریری سوسائٹی کے پریزیڈنٹ منتخب ہوئے اور انہیں اپنی شاعرانہ تخلیقات مشاعروں میں پڑھنی پڑیں۔ان کی نظم " بنسری کی آواز " نے مولوی انوار الحق کو بہت متاثر کیا۔وہ اس وقت اردو فیکلٹی کے ڈین تھے۔اُنھوں نے پیشین گوئی کہ اسرار احمد بہت بڑے شاعر بنیں گے۔لیکن جب اسرار احمد پر ابن صفی کا رنگ چڑھا تو وہ اسرار ناروی کے قتل کے لئے ان سے سے ہمیشہ ناراض رہے۔اسرار احمد نے پہلے الہ آباد یونیورسٹی جوائن کی لیکن بعد ازاں مختلف وجوہات کی بنا پر اپنی بیچلرز کی ڈگری آگرہ سے لی۔

1948 میں شعبہ شاعری کے آڈیٹر کے طور پر نکہت پبلیکیشنز میں جاب شروع کی۔اس کے بعد وہ بطور ٹیچر بھی کام کرتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی تعلیم بھی مکمل کرتے رہے۔نکہت پبلیکیشنز میں وہ طغرل فرغان اور سنکی سولجر کے نام سے مزاحیہ تحریریں تخلیق کرنے لگے۔۔1952 میں وہ پاکستان ہجرت کر گئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔

ابن صفی اسرار ناروی اور طغرل فرغان کے نام سے اپنی پہچان بنا چکے تھے۔وہ مزاح اور شاعری کے باب میں جس رفتار سے کام کر رہے تھے ان کے ابتدائی کلام اور مزاح کی پختگی دیکھ کر ان کے روشن مستقبل کی نوید ضرور کئی بزرگوں نے سنائی ہو گی۔لیکن مشیت ایزدی کو کیا منظور تھا یہ اس وقت کوئی نہیں جانتا ہو گا۔1951 کا سال ابن صفی کی زندگی کا تاریخی سال کہا جا سکتا ہے۔۔اس سال انہوں نے ایک ادبی حلقہ میں ہوئی بحث سے متاثر ہو کر اردو میں شفاف اور طبع زاد جاسوسی ادب کی بنیاد رکھنے کا دعویٰ کیا اور اس کام میں ایسے لگے کہ اسرار ناروی اور طغرل فرغان کہیں کھو گئے۔ابن صفی کے اندر چھپا حساس شاعر مدتوں تک دبا رہا۔ضروریات زندگی، معاش اور مقبولیت کی دیوی نے ابن صفی کو ایسا جکڑا کہ اسرار ناروی کو بالکل نظر انداز ہونا پڑا۔

ابن صفی نے عباس حسینی کے ماہنامہ نکہت پبلیکشنز میں جاسوسی دنیا کی شروعات کی۔اس کے بعد جو ہوا وہ ادب کی تاریخ میں رقم ہے۔ایک ایسے سفر کی شروعات ہوئی جو ان کی وفات تک مسلسل مائل بہ عروج رہا۔۔ابن صفی نے دیکھتے ہی دیکھتے عروج حاصل کیا اور ان کی شہرت ہندوستان اور پاکستان میں اردو اور ہندی پڑھنے والے باذوق افراد تک جا پہنچی۔کہا جاتا ہے کہ ابن صفی کی شہرت وبا کی طرح پھیلی تھی۔ایک زمانہ ان کی ہر آنے والی تخلیق کا منتظر رہتا تھا۔

ابن صفی نے جہاں اردو جاسوسی ادب کو ایک نئی جہت دی وہیں اسرار ناروی کو پیچھے دھکیل دیا اس دور میں ان کی لکھی شاعرانہ تخلیقات برائے نام رہیں۔بظاہر تو ابن صفی کے نام کی چکاچوند نے اسرار ناروی کو دنیا کی نظروں میں دھندلا دیا۔

لیکن اسرار ناروی حالات کے ستم کا شکار ہونے کے باوجود کبھی کبھار ابن صفی کی بلند و بالا دیوار سے جھانک کر اپنے ہونے کا احساس دلانے کی کوشش کرتے اور ابن صفی کو للکارتے اور اپنے وجود کو زندہ رکھنے کی سعی کرتے۔ اس کی جھلک ہمیں ابن صفی کے ناولوں کے شاعرانہ ٹائٹل اور بہترین منظر نگاری میں صاف نظر آتی رہی۔۔ جانے انجانے میں ابن صفی کے پردے میں چھپا سچا اور حساس شاعر اور کھل کر سامنے آنے لگا۔

اس بیچ دونوں جہتوں میں ہر گذرتے دن کے ساتھ تلخی بھی بڑھتی رہی۔ اسرار احمد نے اپنے قتل پر ابن صفی کو کبھی معاف نہیں کیا اور ابن صفی نے اسرار احمد کی ضد کو بچپنا سمجھا۔ دونوں کے مابین اس تلخی نے اردو ادب کو ایک نئی صنف اور لطف سے روشناس کرایا۔ اس مخالفت مخاصمت اور اپنے اپنے وجود کی بقا کی جنگ میں کبھی اسرار ناروی ابن صفی کے اندر سے جھلکتے اور کبھی اسرار ناروی کے کلام میں ابن صفی ملتے۔ ایک دوسرے پر طنز و مزاح کے نشتر بھی چلاتے اور کبھی کبھی ایک دوسرے سے اپنا آپ منوا بھی لیتے کیونکہ دونوں کو ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے انکار نہیں تھا لیکن دونوں ہی اپنے وجود کو قربان کرنے کو تیار نہیں تھے۔
ابن صفی کا پلڑا کئی وجوہات سے بھاری رہا اس وجہ سے اسرار ناروی کی زبان تلخ ہوتی گئی۔ اس کے جواب میں کبھی ابن صفی اسرار ناروی کی عظمت کو تسلیم کرتے اور کبھی طنز کے نشتر سے ان کو چھلنی بھی کر دیتے۔

ابن صفی اور اسرار ناروی کی اس چپقلش اور ادبی تفریق نے اردو ادب میں ایک نئی روایت کو جنم دیا۔ ایک ہی انسان کے اندر موجود دو الگ جہتوں کے تصادم کے بعد اسرار ناروی اور ابن صفی کے ہاں ایک دوسرے پر طنز و مزاح اور تنقید کا ایسا دفتر کھلا جس نے کبھی تو پڑھنے والوں کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دی اور کبھی سنجیدگی سے مطالعہ کرنے والوں کو چونکا ڈالا۔ ایک ہی انسان کے دماغ میں دو الگ حیثیت کے مکمل ادبی انسان پل رہے تھے اور دونوں اپنی جگہ بہترین تھے اب دونوں میں سے کسی ایک نے دوسرے پر سبقت تو لے جانی تھی۔ ابن صفی نے اسرار ناروی پر کھلم کھلا طنز کے نشتر چلائے کیونکہ ابن صفی کو دوام تبھی حاصل ہو سکتا تھا جب اسرار ناروی دب جاتا۔ دوسری طرف اسرار ناروی دبا ضرور، لیکن اس نے اپنے فن پر سمجھوتا نہیں کیا بلکہ اس کو جب بھی موقع ملا اس نے ابن صفی کو ادبی کچو کے لگائے۔
ابن صفی کبھی اسرار ناروی کو سمجھاتے اور کبھی تنگ آکر اپنے جاسوسی ناولوں میں شاعری اور شعرا کے کچھ نقشے کھینچتے تا کہ اسرار ناروی جان سکے کہ اگر ابن صفی نہ ہوتے تو اسرار ناروی کی حیثیت کیا ہوتی۔
ابن صفی مزاح کے میدان میں حیوان ظریف تھے۔ اس کا سب سے بڑا مظاہرہ انہوں نے اپنے ہی وجود میں چھپے شاعر اسرار ناروی پر طنز کر کے کیا جب وہ اسرار ناروی کو شعرا کی حیثیت اور حقیقت دکھا رہے تھے۔
انہوں نے اپنے ابتدائی کرداروں میں ناشاد کا کردار متعارف کروایا جو جاسوس ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھا۔ اس کی شاعری بلکل بے وزن ہوا کرتی اور وہ ہمیشہ بحروں کی تقطیع " اب کھٹ کھٹ " کے اوزان پر کرتا ہے۔ ناشاد کا کردار ایک ایسے انسان کا ہے جو بننا تو شاعر چاہتا تھا لیکن قسمت سے سیکریٹ ایجنٹ بن جاتا ہے لیکن شاعری چھوڑ نہیں پاتا۔ اس کی بے وزن شاعری سے ابن صفی دو کام کرتے ہیں ایک تو یہ ثابت کرتے ہیں کہ جب انسان دو کام کرنے لگے تو بسا اوقات دونوں بگڑ جاتے اور خاص طور پر شاعری تو بالکل ہی تہہ و بالا ہو جاتی ہے لیکن دوسرا پہلو ابن صفی اور اسرار ناروی کا مشترکہ دکھ بھی ہے اور اکثر لوگوں کی زندگی کا المیہ بھی کہ وہ زندگی کی جدوجہد میں لگ کر اس کام سے دور ہو جاتے ہیں جو ان کے دل کو عزیز تر ہوتا ہے۔ جیسے ابن صفی شاعری سے دور ہو گئے۔

" یار کیا کرتا۔ ناشاد بسور کر بولا۔" شعر کہنے میں اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے جتنی بچہ جننے میں"

"ارے تو تم شعر کہہ رہے تھے؟"

"کہنا پڑتا ہے۔۔ بلکل اسی طرح جیسے کوئی نوالہ حلق میں اٹک جائے۔ یا اگل دو یا نگل جاؤ ۔ خدا کی قسم کلیجہ خون ہو رہا ہے اپنا کیا شاندار مشاعرہ چھوٹا ہے۔ "۔۔۔۔۔(کالے چراغ)

لڑکیوں کا جزیرہ میں جب پہلی بار سارجنٹ ناشاد کا کردار بطور شاعر قارئین کو نظر آتا ہے تو ابن صفی اس کے ذریعے اسرار ناروی پر طنز کرتے ہیں کہ دیکھو آج کل کے شاعر در حقیقت ایسے ہیں جو چند چمچہ گیروں کے ساتھ غالب و میر سے بھی بھڑ جانے کا دعویٰ رکھتے ہیں لیکن ان کی اپنی شاعری کا وزن تک درست نہیں ہوتا۔ اس منظر میں ابن صفی نے ناشاد اور اس کی شاعری کا مزاحیہ نقشہ کھینچا ہے۔

"سارجنٹ ناشاد ایک غزل کہہ رہا تھا۔۔ سامنے رکھے ہوئے کاغذ پر اس نے بہت سے قوافی لکھ رکھے تھے۔ ان قافیوں میں ایک ایک مصرعہ کہہ کر ان پر گرہیں لگاتا جا رہا تھا۔ اچانک ایک مصرعے پر اسے گاڑی رکتی ہوئی سی معلوم ہونے لگی۔ اس نے اس کی تقطیع شروع کر دی۔

غم جاناں۔ ابے کھٹ کھٹ۔۔ لہو بن کر۔۔ ابے کھٹ کھٹ۔۔ ہاٹھیک تو ہے۔ غم جاناں لہو بن کر ٹپک آنکھوں سے کچھ یوں بھی۔

ابے کھٹ کھٹ۔۔ ابے کھٹ کھٹ۔ ابے کھٹ کھٹ۔۔ ابے کھٹ کھٹ

سارجنٹ ناشاد اسی طرح مصرعوں کی تقطیع کرتا تھا۔ فاعلاتن فاعلات کے بکھیڑے آج تک اس کی سمجھ ہی میں نہیں آتے تھے۔۔ ویسے وہ اکثر دوسرے شعرا کو عروض سے ناواقف اور بلکل ہی کندہ تراش بتایا کرتا تھا۔

سارجنٹ ناشاد فوجی آدمی تھا۔ تعلیم بھی واجبی سی تھی لیکن اس کے باوجود اسے جگت استاد ہونے کا دعویٰ تھا اور اس کے ساتھ والے اس کی استادی کے قائل بھی تھے کیونکہ اکثر اس کے اشعار میر و غالب جیسے اساتذہ کے اشعار سے بھی لڑ جاتے تھے۔"

ابن صفی کا جاسوسی ناولوں میں سب سے مقبول شاعر کردار استاد محبوب نرالے عالم تھا۔ اس کردار میں انہوں نے فی زمانہ شعراء کے حالات کا نقشہ کھینچ کر اسرار ناروی کو تنبیہ کی ہے کہ انسان بے شک نادر شاہ درانی کے خاندان سے ہو جب وہ شاعری سے جڑتا ہے تو آج کے دور میں یہ شعبہ اس کو چنا جور فروخت کرنے والا بنا دیتا ہے۔ یعنی آج کے دور میں شاعر اور شاعری دونوں کی کوئی عزت نہیں رہی بلکہ خود ابن صفی نے جو عزت بطور ابن صفی کمائی ہے اس کو بھی اسرار ناروی کی وجہ سے خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔

پاگلوں کی انجمن میں استاد کا حسب نسب کچھ اس طرح بیان ہوا ہے۔۔

" اچانک ایک دن استاد محبوب نرالے عالم کو اطلاع ملی کہ یہ سیاسی بیداری کا زمانہ ہے۔ لیکن اتفاق سے یہ ان کی بیکاری کا زمانہ نہیں تھا۔ انہوں نے ان دنوں جیوتش اور تعویذ گنڈے کی آڑھت "کر رکھی تھی۔ ان کا یہ کارخانہ "ایک چلتی ہوئی سڑک کے کنارے ایک تخت پر واقع تھا۔ اگر کوئی پوچھتا کہ بھائی اس دھندے سے کیونکر لگے تو بڑی عقل مندی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے....

"چنگیز بابا کی نسل سے ایک قلندر بابا عمران شاہ ہیں۔ ان کی نظر عنایت ہو گئی ہے۔ میں بھی اسی نسل سے ہوں۔ لیکن میرا سلسلہ ڈفال خاں سے ملتا ہے جو چنگیز خان کے دادا زاد بھائی تھے۔" پھر یک بیک ہنس کر فرماتے " نہیں.... وہ ڈفالی اور ہوتے ہیں آپ وہ نہ سمجھئے گا.... ڈفال خان دوسرے تھے۔"!

اگر اس وقت کوئی ان کا قریبی شناسا موجود ہوتا تو استفسار کرنے والے کے رخصت ہو جانے پر اس سے رازدارانہ انداز میں کہتے۔ "بھائی کیا بتاؤں یہ بزنس کا معاملہ ہے، ورنہ میں تو دراصل نادر شاہ درانی کے سلسلے سے تعلق رکھتا ہوں۔"!

استاد محبوب نرالے عالم جاسوسی ناولوں سے پرے ایک حقیقی کردار بھی تھے۔ کراچی کی سڑکوں پر چلتے پھرتے جیتے جاگتے انسان کو اپنی تراشی دنیا اور کہانی کا کردار بنا دینا اور پھر اس سے اسرار ناروی کے شوقِ شاعری پر چوٹ کرنا ابن صفی کا ہی خاصہ تھا۔
ابن صفی نے محبوب نرالے عالم کے کردار کو ایک شاعر کے کیری کیچر کے طور پر پیش کیا۔ یہ تمسخر صرف ایک فرد پر نہیں ہے نہ ایک شاعر پر بلکہ یہ معاشرے کے ان حالات پر بھی چوٹ ہے جن کی بدولت ایک شاعر چنا فروش بن جاتا ہے اور اس کا فن اس کا مذاق بن جاتا ہے۔ مزاح کے پیرائے میں سب کچھ کہہ جانا ابن صفی کا کمال تھا۔ محبوب نرالے عالم اعلی حسب نسب رکھتے ہوئے چنے بیچتے ہیں۔ اس کردار کو ہم معاشرے کی بے حسی اور ناقدری کا استعارہ بھی سمجھ سکتے ہیں۔
استاد محبوب نرالے عالم کی شاعری کا حال ابن صفی نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

"شاعر کس پائے کے ہوں گے۔ یہ تو تخلص ہی سے اندازہ ہو جاتا.. اتنا لمبا چوڑا تخلص شاید ہی کسی مائی کے لال کو نصیب ہوا ہو۔ محبوب نرالے عالم۔۔۔
استاد کا قول تھا کہ بڑا شاعر وہی ہے جس کے یہاں انفرادیت بے تحاشہ پائی جاتی ہو۔۔۔۔ لہذا ان کا کہا ہوا شعر ہمیشہ بے وزن ہوتا تھا۔۔۔
فرماتے تھے اوزان تو سبھی کی شاعری میں ہوتا ہے لہذا میری بے وزنی ہی میری انفرادیت ہے۔ اور اس طرح مجھے بہت بڑا شاعر تسلیم کیا جانا چاہئے۔ بسر اوقات کے لئے پھیری لگا کر مسالے دار سوندے چنے بیچتے تھے۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جو بھی پکڑ پاتا بری طرح جکڑ لیتا بڑے بڑے لوگوں سے یارانہ تھا.... پھر عمران کیسے محروم رہتا۔
"کوئی عمدہ سا شعر استاد۔۔۔ عمران انہیں کی میز پر جمتا ہوا بولا۔
استاد نے منہ اوپر اٹھایا۔ تھوڑی دیر ناک بھوں پر زور دیتے رہے پھر جھوم کر بولے۔ سنئے"
حسن کو آفتاب میں صنم ہو گیا ہے
عاشقی کو ضرور بے خودی کا علم ہو گیا ہے۔"

دوسری جگہ استاد کو ذکر کچھ اس طرح آتا ہے۔
"تم بھلا باز آؤ گے غالب
راستے میں چڑھاو گے غالب
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی
یہ تو وزن دار ہے استاد؟ عمران نے حیرت سے کہا
"میں نے بتایا نا غالب کی روح حلول کر گئی تھی۔ پھر وزن کیسے نہ ہوتا"
اکثر استاد کے جسم میں بعض مشہور مقدین کی روحیں بھی حلول کر جاتی تھین۔ اور وہ باوزن اشعار بھی کہ نکلتے تھے۔ متاثرین میں سے تو کسی کو قابل اعتنا ہی نہیں سمجھتے تھے

عمران نے استاد کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا

"سنو... اکثر لوگ تمہارے آئیڈیاز چرا لیا کرتے ہیں۔"!

"جی بس کیا بتاؤں....! استاد ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔" نہ صرف وہ لوگ جو زندہ ہیں.... بلکہ وہ بھی جو مر گئے۔"!

"وہ کیسے استاد...؟"

"خواب میں آ کر.... مومن غالب عام طور پر اس قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ میرا شعر تھا۔

بے غیرت ناہید کی ہر تان ہے زمپک

شعلہ سا لپ لپ جھک

اب آپ دیکھئے ٹیلی ویژن والوں سے معلوم ہوا کہ یہ غالب صاحب کا ہے۔؟

"مومن کا ہے استاد! . . . .

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

اب یہی دیکھ لیجئے....! میں نے بے غیرت ناہید کہا ہے.... اور وہ فرماتے ہیں اس غیرت

ناہید....! ہوئی نہ وہی خواب کی چوری والی بات۔"!

ابن صفی نے اسرار ناروی پر جب چوٹیں کیں تو اسرار ناروی بھی اکثر ابن صفی سے ٹکرا جاتے۔ بلاشبہ ابن صفی نے اسرار ناروی کو محدود کر دیا تھا لیکن اسرار ناروی نے اپنے ہونے کا احساس کبھی ختم نہیں کیا بلکہ وہ اپنے کلام میں ابن صفی کو بار بار للکارتا رہا اور دنیا کو بتاتا رہا کہ ابن صفی نے اس کا قتل کیا ہے اسی طرح جب اسرار ناروی اپنے فن کی بے حرمتی پر سیخ پا ہوتا ہے تو وہ اپنی ناقدری پر ابن صفی کو بڑی سختی سے یہ احساس دلاتا کہ انہوں نے اپنی معاشی ضروریات کے لئے کس طرح اپنے اندر کے حساس شاعر کو دبا رکھا ہے۔۔

اسرار ناروی کا جو کلام ستر اسی کی دہائی میں سامنے آتا ہے اس میں بھی تلخی کا رنگ واضح نظر آتا ہے اور اس کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔ وہ اسرار ناروی جس نے 14 15 سال کی عمر میں شاعری کی ابتدا کی اور فراق گورکھپوری، مطفی زیدی اور وامق جونپوری کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کی اس کا مجموعہ کلام اس کی زندگی میں نہ شائع ہو کر دنیا سے رخصت ہونے کے تینتیس برس بعد شائع ہوا۔

اسرار ناروی ابن صفی پر پھٹ پڑتا ہیں اور ان کے قلم کی پختگی ابن صفی سے سوال بھی کرتی ہے اور ابن صفی پر طنز بھی کرتی ہے جب وہ کہتا ہے۔۔

اس شہر خرابی میں لوگو اک ابنِ صفی بھی رہتا ہے

ہے پیٹ کا کتا وہ یعنی جھوٹے افسانے لکھتا ہے

اللہ کا اس کو خوف نہیں، کب عقل کے ناخن لیتا ہے

دیوانگیوں کے شہر بتا ہم کیوں تیری پرواہ کریں

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر اسرار ناروی کہتا ہے۔

یہ کشمکش کا زمانہ یہ آہ فکرِ معاش
بہت ہی تلخ ہے اے دوست زندگی میری

ایک حساس شاعر جسے حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہونا پڑے اس کے اندر کا کرب مختلف انداز میں باہر نکلتا ہے۔

تو ہنس لیں گے اپنے ہی احوال پر ہم
اگر کوئی صورت نہ نکلی خوشی کی

ہم اپنے ارادے سے کب آئے تھے یاں
تو پھر ہے یہ کیسی ہوس زندگی کی

غزل بن گئی زینت بزم عشرت
غزل گو نے افلاس میں خودکشی کی

ابن صفی ہونا اسرار ناروی کو کبھی قبول نہیں تھا اس لیے وہ کبھی ابن صفی کہ شہرت کامیابی اور عروج سے متاثر نہیں ہوا بلکہ اس نے ابن صفی کی کامیابی میں اپنے فن کو کچلنے کا منظر دیکھا تھا کہ کیسے ایک شاعر کے فن کو پامال ہونا پڑا اور شاعر کو پس منظر میں جانا پڑا۔

سود و زیاں کے بازاروں میں ڈھونڈ رہا تھا اپنا مول
بن بہروپ کسی نے قیمت دو کوڑی نہ لگائی

اپنی دوسری جہت اور انسانی جبلت جو کامیابی اور ستائش کی متلاشی تھی اس پر بھی اسرار ناروی بڑے دلفریب انداز میں چوٹ کرتے ہیں۔

ہے کون جس کو اپنی ستائش نہیں عزیز
مارے گئے تھے ہم بھی اسی رُخ پہ دوستو

اسرار ناروی کا سب سے بڑا غم اور ابن صفی پر اعتراض یہی رہا ہے وہ قصے کہانیوں میں ایسے گم ہوئے کہ انہوں نے اسرار ناروی کو بھلا دیا اور آہستہ آہستہ وقت کی رفتار نے ابن صفی کو تو چہار عالم میں معروف و مشہور کر دیا لیکن اسرار ناروی کی کہانی اس کا فن سب کچھ دنیا سے او جھل ہو گیا اور اسی وجہ سے وہ ابن صفی سے کہتا ہے کہ تم نے دنیا جہان کے قصے لکھ ڈالے مگر افسوس میں تمہیں یاد نہیں رہا اور اصل میں تم نے مجھے نہیں اپنے وجود کو بھلا دیا ہے۔

لکھنے کو لکھ رہے ہیں غضب کی کہانیاں
لیکن نہ لکھ سکے کبھی اپنی داستاں

دوسری جگہ اسرار احمد ابن صفی پر عجیب دکھ بھری چوٹ کرتے ہیں کہ ابن صفی نے جو کہا وہی سب میرا بھی فن سمجھا گیا لیکن میرا فن اس سے کہیں بڑا تھا مگر افسوس وہ کبھی سامنے نہ آسکا اور دنیا نے جو دیکھا اسی پر یقین کر لیا۔

جو کہہ گئے وہی ٹھہرا ہمارا فن اسرارؔ
جو کہہ نہ پائے نہ جانے وہ چیز کیا ہوتی

اسی طرح ایک اور جگہ اسرار ناروی نے ابن صفی کو مخاطب کیا ہے کہ تم اپنے اصل سے دور ہو کر ملکوں ملکوں مشہور ہو چکے ہو مگر کیا تم خود کو بھی پہنچانتے ہو۔ تمہیں تمہاری حقیقت بھی یاد ہے ؟ جگ بیتی تو تم نے خوب لکھ دی ہے اب اپنے اوپر بھی نظر کرم کرو۔

پاس پڑوس کے لوگ بھی تم کو پہچانیں تو بات بھی ہے
جگ بیتی لکھ لکھ کے صفی جی یوں تو بہت مشہور ہوئے

ابن صفی اور اسرار ناروی کی اس ادبی دشمنی اور شخصی تفاوت میں کبھی سرد مہری اور کبھی نرمی آتی رہی۔ جب اسرار ناروی کا گلا گھونٹ کر ابن صفی کو اپنایا گیا اس وقت سے اسرار ناروی تو تلخ ہوتے گئے لیکن ابن صفی اپنی ابتداء میں اسرار ناروی کے حوالے سے سخت گیر نہیں تھے انھیں اندر ہی اندر احساس تھا کہ انہوں نے اسرار ناروی کو ختم کیا۔ اسی لئے بطور ابن صفی اپنی تمام جہتوں کو ہلکے پھلکے انداز میں ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے یعنی ان کا خیال تھا کہ اسرار ناروی اور طغرل فرغان دونوں ان کے معاون بن کر ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ اسی وجہ سے آغاز میں عمران کے کردار کو ابن صفی نے پہلے ہی ناول میں شاعرانہ رنگ میں پیش کیا۔

عمران کہانی کے ہر منظر میں جاسوس کے ساتھ ساتھ شاعر بھی نظر آتا رہا یہ ابن صفی کا اسرار ناروی کے رنگ کو اپنے ایک عظیم کردار کے ذریعے اپنانا تھا۔ لیکن عمران کی شخصیت کے تناظر میں یہ تو طے ہے کہ شاعری کا یہ حصہ مزاح سے بھرپور ہونے والا تھا لیکن پھر بھی ابن صفی نے کوشش کی۔ اس کے ساتھ عمران کے ذریعے شعری مزاح صرف اسرار ناروی پر طنز نہیں تھا بلکہ ایک قسم کا افسوس تھا۔

”اس کا مطلب یہ کہ قاتل و مقتول دراصل عاشق و معشوق تھے۔

عمران پیارے، ذرا سنجیدگی سے۔

”یہ تنکا بتاتا ہے کہ یہی بات ہے۔“ عمران نے کہا۔ اور اردو کے پرانے شعراء کا بھی یہی خیال ہے۔ کسی کا بھی دیوان اٹھا کر دیکھ لو! دو چار شعر اس قسم کے ضرور مل جائیں گے جن سے میرے خیال کی تائید ہو جائے گی۔ چلو ایک شعر ہی سن لو۔

موچ آئے نہ کلائی میں کہیں
"سخت جاں ہم بھی بہت ہیں پیارے"

(خوفناک عمارت)

ایک اور جگہ عمران میر کے شعر کا مذاق اڑاتا ہے۔۔ ساتھ غالب اور سودا کے شعر بھی پڑھتا ہے۔

”لیکن یہ ہوا کس طرح؟

اس طرح جیسے شعر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ شعر مجھے بھرتی کا معلوم ہوتا ہے جیسے میر کا یہ

" میر کے دین ومذہب کو کیا پوچھتے ہو

ان نے تو قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا"

بھلا بتاؤ دیر میں کیوں بیٹھا جلدی کیوں نہیں بیٹھ گیا۔

دیر نہیں دیر ہے۔ یعنی بت خانہ " فیاض نے کہا پھر بڑبڑا کر بولا۔ " لاحول ولا قوۃ میں بھی اسی لغویت میں پڑ گیا۔

بعض عقلمند شاعر بھرتی کے شعر اپنی غزلوں سے نکال بھی دیا کرتے ہیں

یار عمران میں باز آیا تمہاری مدد سے۔

" مگر مری جان یہ لو دیکھو . . .

نقش فریادی ہے کسی کی شوخی تحریر کا.

لاش غائب کرنے والے نے ابھی خون کے تازہ دھبوں کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ مرزا افتخار رفیع سودا یا کوئی اور صاحب فرماتے ہیں۔

قاتل ہماری لاش کو تشہیر دے ضرور

آئندہ تا کہ کوئی نہ کسی سے وفا کرے"

عمران کے اس شاعرانہ انداز کو قارئین نے بھی سراہا۔ یہ ابھی عمران کا آغاز تھا۔ اس آغاز کو دیکھتے ہوئے عین ممکن تھا کہ عمران کے ذریعے شعری ادب کو جاسوسی ادب کا حصہ بنایا جاتا لیکن دوسری جانب اسرار ناروی کو اپنی پیروڈی، کیری کیچر یا خاکے سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ وہ تو اپنی مسلمہ حیثیت کو منوانا اور جینا چاہتے تھے۔ اسی باعث ابن صفی کا یہ کام ان کے لہجے کی تلخی کم نہ کر سکا بلکہ وہ پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔

اسرار ناروی کے اس رویے کا جواب ابن صفی نے عمران کے ذریعے دیا جب عمران دو الگ اشعار کو ملا کر مزاح کا پہلو تراشتا ہے۔ یہ اردو مزاح کی ایک معروف ترکیب ہے جس میں دو مختلف اشعار کو ملا کر ایک نیا شعر تخلیق کیا جاتا ہے یہ اردو ادب میں در حقیقت ابن صفی کا کارنامہ ہے۔

ابن صفی نے دسمبر 1955 میں شائع ہونے والے عمران سیریز کے تیسرے ناول " پراسرار چیخیں " میں یہ ترکیب پہلی بار قارئین کے سامنے پیش کی. جب ایک سین میں عمران فیاض کے دفتر میں یہ شعر پڑھتا ہے

ہے دل شوریدہ غالب طلسم پیچ وتاب

وہ صبا رفتار شاہی اصطبل کی آبرو

اس کے بعد کئی ناولوں میں یہ ترکیب آئی۔۔

ان کو آتا ہے پیار پر غصہ
ہم ہی غالب کر بیٹھے تھے پیش دستی ایک دن (بھیانک آدمی)

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
کوئی بندہ رہا اور نا کوئی بندہ نواز (قبر اور جنجر)

بنا کر یتیموں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں (آہنی دروازہ)

رات کا منظر سہانا ہے بہت
نیک مائی نیک بابا دے خدا کے نام پر (حماقت کا جال)

یہ مزاح کے پیرائے میں کہے گئے اشعار ہیں جو یقیناً قارئین کے چہروں پر مسکان لاتے ہیں۔ لیکن یہ ابن صفی کی دراصل اسرار ناروی کو تنبیہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ میں بھی اگر جوابی کاروائی پر اتر آؤں تو بہت کچھ کہہ سکتا ہوں لیکن میں اسرار ناروی سے الجھنا نہیں چاہتا۔ اس پورے دور میں اسرار ناروی نے کبھی ابن صفی کو قبول نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اپنے فن کی ناقدری اور شخصیت کو مسخ کرنے پر ابن صفی کو اشعار میں کھری کھری سنائیں۔

گذرتے وقت کے ساتھ زندگی کے آخری ایام اور بیماری کے شدید دنوں کے بعد شاید دونوں جانب کچھ برف پگھل گئی کیونکہ ابن صفی اردو دنیا کے سب سے بڑے مصنف بن چکے تھے۔ اور اب دشمنی کا دور ان کے حساب سے پیچھے جا چکا تھا لہٰذا وہ اپنی طرف سے اس دشمنی سے دستبردار ہو چکے تھے۔ اسرار ناروی ان کے سامنے بہت چھوٹا پڑ چکا تھا اس وجہ سے ابن صفی نے طنز و تشنیع کم کر دی۔ اور مخالفت آہستہ آہستہ دم توڑنے رہی تھی۔

دوسری طرف اسرار ناروی نے بھی اپنے وجود کے احترام کو برقرار رکھتے ہوئے کہیں نہ کہیں ابن صفی کی عظمت کو مان لیا تھا۔ یہ دونوں جانب سے ایک خاموش مصلحت تھی یعنی ایک دوسرے کو قبول کرنے کا آغاز تھا۔ اسرار ناروی اپنی بے قدری پر افسردہ تھے لیکن وہ ابن صفی سے لڑ لڑ کر تھک گئے تھے اسی طرح ابن صفی بھی ماضی میں جھانک کر جانتے تھے کہ ان کی وجہ سے اسرار ناروی کے ساتھ بہت ظلم ہوا تھا۔

اس بیچ جب ابن صفی میگزین نکالا گیا۔ ابن صفی نے اسرار ناروی کا ہاتھ تھام کر اسے بھی اپنے قریب کر لیا اور ڈائجسٹ میں اسرار ناروی کو جگہ دینے لگے۔ یوں دونوں کے مابین ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ جب ڈائجسٹ میں قارئین کی جانب سے سوال اٹھتے تو کبھی ابن صفی سے اسرار ناروی نے جھانکا اور کبھی اسرار ناروی سے ابن صفی نظر آتے۔ اور یہاں پر دونوں شاید مدتوں بعد یکجا ہونے لگے اگر ہم ابن صفی کے قارئین کے خطوط پر جوابات پڑھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود اسرار ناروی پر جتنا بھی طنز کرتے رہے یا ان سے نالاں رہے لیکن کبھی کسی دوسرے نے اسرار ناروی پر کچھ کہا تو ابن صفی نے اس وقت اسرار ناروی کا خوب دفاع کیا۔ ان جوابات کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے دونوں جہتیں یکجا ہو گئی تھیں اور یہ جواب دونوں مل کر لکھا کرتے تھے۔ ابن صفی کو پڑھتے پڑھتے اچانک اسرار ناروی کا انداز آجاتا ہے اور اسرار ناروی کے کہتے کہتے ابن صفی کی جھلک قاری کو مل جاتی ہے۔

یہ پیش رس دونوں جہتوں کے درمیان سرد و گرم جنگ کا خاتمہ محسوس ہوتے ہیں کیونکہ ابن صفی اپنے عروج پر تھے اور اسرار کی جدوجہد اس وقت بھی جاری تھی۔ ابن صفی کو زندگی کے آخری لمحات میں یقیناً اندر سے کچوکے لگتے ہوں گے کہ انہوں نے اسرار ناروی کے فن کو نظر انداز کیا تھا اسی وجہ سے ڈائجسٹ میں دونوں یکجا نظر آتے ہیں۔

ابن صفی کے لکھے یہ پیش رس صرف ابن صفی کے نہیں ہیں بلکہ یہ اسرار و صفی کے اندر چھپے کرب کی کہانی ہے جسے دونوں ہنس کر بیان کرتے ہیں۔

(ستمبر 1977ء)

میری پہلی غزل میں کاتب کی عنایت سے اور پروف پروف ریڈ صاحب کی بے خودی کی بنا پر پانچویں شعر کا دوسرا مصرعہ واقعی بے وزن ہو گیا تھا لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی حتیٰ کہ وہ میانوالی والے صاحب کے بھی جنھیں میری ایک پوری غزل بے وزن نظر آئی تھی۔

بہر حال اس مصرعے کو یوں پڑھیے۔

کانٹا کسی یاد کا لگا ہے

کاتب صاحب شاید سمجھے تھے کہ میں کسی کے ساتھ کی لکھنا بھول گیا ہوں اور پروف ریڈر صاحب نے غزل سامنے آتے ہی پروف ریڈنگ کی بجائے ہیڈ بیٹنگ سر دھنا شروع کر دیتے ہیں لہٰذا ایسی فروگذاشتوں کا احتمال رہتا ہے۔ ایک صاحب نے پوچھا ہے کہ میگزین کی سالگرہ کا جشن کس طرح منایئے گا جواباً عرض ہے کہ اپنی ان غزلوں کی قوالیاں کرادوں گا جو میگزین میں اس وقت تک شائع ہو چکی ہوں گی شاید اس طرح میری شاعری کی تقدیر بھی کھل جائے۔

(دسمبر 1978ء)

اب وہ صاحب متوجہ ہوں جنھیں میرے شاعر ہونے پر بے حد غصہ آیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں صرف جاسوسی ناول لکھتا رہوں اور ملا دوپیازہ " بھی میری " شان " کے خلاف ہے وغیرہ وغیرہ۔ آمے بھائی کیا عرض کروں بہتیری بری عادتوں میں مبتلا ہوں۔ اگر ناول نویسی کی راہ پر نہ لگ گیا ہوتا تو مصور بھی ہو سکتا تھا، گلوکار بھی ہو سکتا تھا۔ ویسے اگر کبھی اگر کبھی اپنے پیشے سے اکتا کر ایک آدھ غزل یا نظم بھی کہہ لی تو کون سی آفت آگئی۔ اسے بھی برداشت کیجیے۔

(مئی 1979ء)

ہاں، ان صاحب سے ضرور دو دو باتیں ہوں گی جنہوں نے لکھا ہے کہ میں شاعری میں بہت بے باک ہو جاتا ہوں۔ ان کا مطلب ہے کھل جاتا ہوں.. بھائی کہیں تو کھلنے دیجیے۔ فرشتہ نہیں ہوں۔ آپ چاہتے ہیں کہ " ہیرا پھیری سے بھی جاؤں۔ یہ میرے بس سے باہر ہے۔ عشق کی ایک داستان خود اللہ میاں نے بھی ہمیں بتائی ہے (سورۃ یوسف غور سے ملاحظہ فرمایئے) بات دراصل پیرایہ اظہار کی ہوتی ہے۔ اگر میں نامناسب طور پر کچھ کہتا ہوں تو مجھے ضرور آگاہ فرمائے۔ میں، آپ کا شکر گزار ہوں گا اور نہ اگر محض "عشق "ہی کے ذکر پر آپ بھڑک اٹھتے ہیں تو پھر آپ ہر غزل کے ساتھ حلف نامہ لگانے کا بھی مشورہ دیں گے کہ میں نے یہ قصیدہ اپنی گھر والی کی شان میں عرض کیا ہے، کوئی نامحرم خاتون اس میں involve نہیں ہیں۔

(دسمبر1977ء)

جی ہاں! میری غزل میں پھر کتابت کی غلطی رہ گئی تھی۔ چھٹے شعر میں " ابر " کی بجائے ابد " چل گیا تھا۔ مصرعے کو یوں پڑھیے:

گر زلف سیاہ ابر کی لہرائے تو کیا ہو

آخری شعر پر میرے گیارہ عدد پڑھنے والوں کو رونا آ گیا لہذا اظہار ہمدردی ایک عدد خط گیارہ افراد کے دستخط سمیت روانہ فرمایا ہے اور پوچھا ہے کہ آخر وہ کون بد نصیب ماہ وش ، گلبدن اور عشوہ طراز ہیں جنہیں آپ پر ترس نہیں آتا۔ ہمیں ان کے پتوں سے آگاہ کیجیے۔ ہم انھیں آپ کی خوبیاں بتا کر سفارش کر دیں گے۔

(نومبر1977ء)

ایک اور خط بھی ہے پچھلے شمارے غزل کے اس شعر کی وضاحت چاہی ہے ایک صاحب نے

تجھ سے پہلے تو بہت سادہ و معصوم تھا دل

تجھ سے بچھڑا تو کئی بار گنہگار ہوا

یہ پوچھا ہے کہ آج کل کونسا نمبر چل رہا ہے فرماتے ہیں کہ مبہم باتیں نہ کیا کیجیے ہر گناہ کی تفصیل ضروری ہے اور یہ تفصیل نثر میں پیش کیجیے مزہ آجائے گا۔

میں نے کہا بھائی یہ شعر یادوں کی بارات کا مخفف نہیں ہے خدا کی پناہ آپ نہ جانے کیا سمجھ بیٹھے۔ میاں یہ دل کی باتیں ہیں میری نہیں دل بچارہ دکھے چاہے اور گھٹ گھٹ کر رہ جائے۔ یارو کیا شاعری بالکل ترک کروادو گے آخر میری ہی غزل میں یہ مین میخ کیوں نکالی جارہی ہیں۔

پیشرس

(اکتوبر1977ء)

اور ہاں بھائی یہ صفحہ دل تو دردسر بن گیا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس صفحے کے علاوہ پورے میگزین میں اور کچھ ہوتا ہی نہیں آخر تنقید کے لیے صرف میری غزل ہی کیوں رہ گئی ہے ایک صاحب نے پچھلی غزل کے اس شعر کو ہدف بنایا ہے۔

تیرے کاشانے کی تعمیر کو کیا نذر کروں

میری تقدیر کا پتھر ہے ترے گھر کے لیے

فرماتے ہیں کیا یہ غزل کا شعر ہے یہ تو کسی تعمیراتی ٹھیکیدار کی کاوش معلوم ہوتی ہے ۔ میرے بھائی جس طرح شاعری میں ایک چیز ضرورت شعری ہوتی ہے اسی طرح عشق کی بھی کچھ ضرورتیں ہیں ضرورت شعری سکندر کو اسکندر اور لیکن کو لیک بنا دیتی ہے اور ضرورت بسا اوقات اس قسم کے شعر کہلواتی ہے۔ بقول فراق

کچھ آدمی کو ہیں مجبوریاں بھی دنیا میں

ارے وہ درد محبت ہی سہی تو کیا مر جائیں

بہر حال اس شعر کی وجہ سے پورے غزل کہنے پڑی تھی لہذا اس شعر کے علاوہ کسی اور شعر کو اہمیت نہ دیجیے کے حاصل غزل یہی شعر ہے۔

اسرار ناروی نے جاسوسی ادب کے سب سے بلند و بالا ادیب کو تا عمر للکارا لیکن کسی نے اسرار ناروی پر غور نہیں کیا۔ وفات کے دہائیوں بعد جب اسرار ناروی اپنے پورے رنگوں کے ساتھ منظر پر آیا تو ایک دنیا حیران رہ گئی کیونکہ ابن صفی کی دیوار کے پیچھے چھپے اسرار ناروی نے شاعری بہت کم کی لیکن اس کا معیار استاد شعراء کے ہم پلہ رہا۔

آج ابن صفی کے ساتھ ساتھ ایک دنیا اسرار ناروی کے فن پر بھی بات کرتی ہے اور اسرار ناروی کو اس کا حق اس کے حصے کی محبت قدر اور چاہت آج اسرار ناروی کا قاری دے رہا ہے۔ ابن صفی آج حیات ہوتے تو وہ اسرار ناروی کی کامیابی پر خوش ہوتے کیونکہ ان کا اسرار ناروی کو دبانا اس دور کی ضرورت تھی وگرنہ اردو ادب جاسوسی ادب کے ذائقے سے ہمیشہ محروم رہ جاتا۔ آج اسرار و ابن صفی دونوں ایک دوسرے کی ضد نہیں رہے بلکہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل ہیں۔ دونوں کے قاری ایک دوسرے سے گریزاں نہیں بلکہ وہ دونوں کو ساتھ پڑھنا لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔

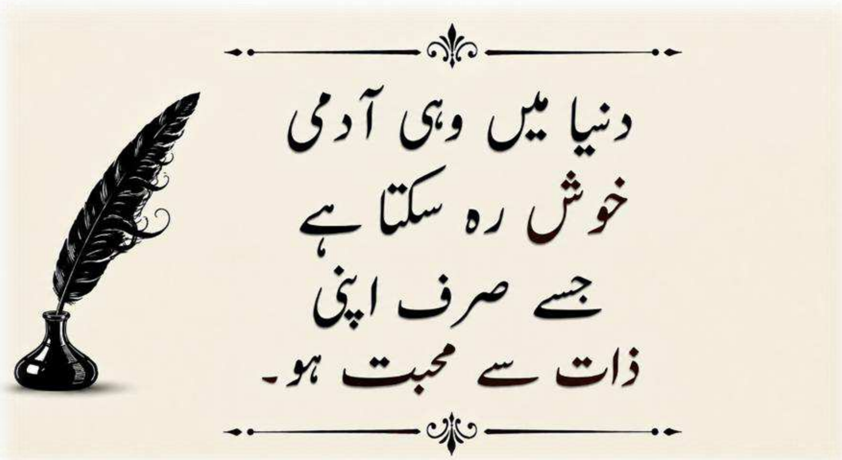

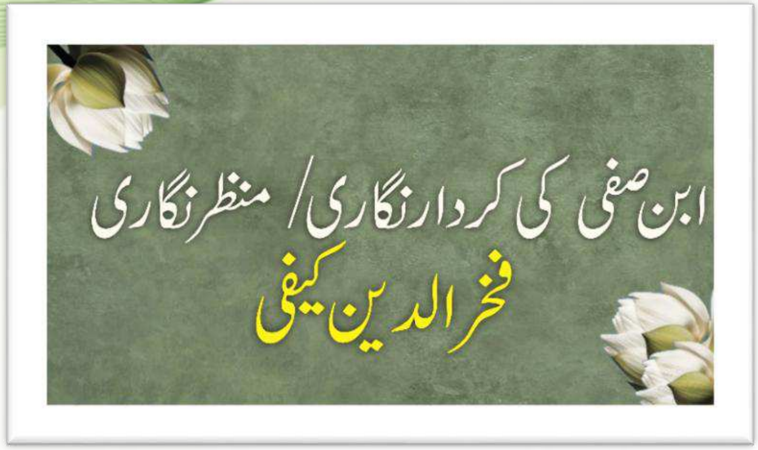

ناول اور افسانوں میں جہاں کہانی، الفاظ کے چناؤ، تکنک کے ساتھ ساتھ کلائمیکس، اینٹی کلائمیکس اور تجسس کی اہمیت ہے وہاں کردار نگاری اور منظر کشی بھی کچھ کم اہم نہیں۔ گرچہ کبھی کبھی کہانی کی ڈیمانڈ کی وجہ سے منظر نگاری کی اہمیت کم ہو سکتی ہے بلکہ یہ کہانی میں بوجھل پن بھی پیدا کر دیتی ہے لیکن ایک اچھا مصنف مختصر ترین الفاظ میں منظر کشی کر کے نہ صرف بوجھل پن دور کر دیتا ہے بلکہ کہانی کا حسن بھی بڑھا دیتا۔

اس ہی طرح کردار نگاری کی بھی اپنی اہمیت ہے اور اس کے لیئے مصنف کو کہانی اور کرداروں کی مناسبت سے طوالت سے کام لینا پڑتا ہے جس کے لیئے 500 سے لیکر 1200 صفحات تک اردو کے ناول نگار بروئے کار لاتے ہیں جن کی مثال ناول انور، شمیم سے لیکر علی پور کا ایلی تک میں ملتی ہے۔ لیکن 110 سے 125 صفحات تک محدود رہنے والے مصنف کے لیے یہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے کیوں کہ ابن صفی نے اپنے کئی ناولوں میں یہ کر کے دکھایا ہے اور وہ بھی اتنی کامیابی کے ساتھ کہ ہزاروں صفحات سے تخلیق پانے والے کرداروں کی بہ نسبت سوڈیڑھ سو صفحات والے کردار قارئین کے ذہنوں سے اس طرح چپک کر رہ گئے ہیں کہ زبان زدِ عام ہیں اور لطف یہ کہ یہ ان کرداروں کے علاوہ ہیں جنہیں عام فہم زبان میں ہیرو یا مرکزی کردار کہا جاتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو یہ ثانوی ہی نہیں بلکہ منفی بھی ہوتے ہیں۔

ابن صفی کے ناولوں کی خصوصیت یہ ہے کہ چند خصوصی ناولوں کو چھوڑ کر عمران کے ناول 110 اور فریدی کے ناول 125 صفحات پر مشتمل رہے ہیں۔ ان کہانیوں کی تکنک ایسی جو کردار یا منظر نگاری کی بجائے تجسس اور کلائمکس کی زیادہ متقاضی رہی ہیں۔ اس پر ستم یہ بندش کہ محدود صفحات سے زیادہ نہ ہو جائیں جس کا حل ابن صفی نے مجبوراً یہ نکالا کہ کہانی کو ایک سے زیادہ حصوں میں پیش کر دیا۔ ان بندشوں کے باوجود ابن صفی نے کبھی کبھی تو ایسی منظر نگاری کی اور وہ بھی اتنے مختصر الفاظ میں کہ صفحات پر صفحات کالے کرنے والے وہ تاثر نہ پیدا کر سکے جو ابن صفی نے چند الفاظ میں پیش کر دیا۔ اس کے لیئے ہمارا تجربہ بھی مستند ہو سکتا ہے کیونکہ ضخیم ناولوں میں ضخامت بڑھانے کے لیے ایسی منظر کشی کی جاتی ہے کہ منظر سے لطف اندوز ہونے کی بجائے صفحات پلٹتے بنتی ہے۔ جبکہ ابن صفی کا پیش کیا ہوا منظر پڑھنے والے کے رگ و پے میں سما جاتا ہے۔ مثلاً

۔ جھلسانے والی گرمی میں ریت کے طوفان میں گھرے کیپٹن حمید کی پریشانی بیان کرتے ہیں تو قارئین کے پسینے ہی نہیں چھوٹتے بلکہ انہیں اپنی ناک میں ریت کے ذرے بھی گھستے محسوس ہوتے ہیں۔

اٹلی کی برف پوش پہاڑیوں کے موٹیل کی مالکہ جب کیبل کار کر کو دور سے آتا دیکھ کر کافی کا برتن چولھے پر رکھتی ہے تو ہال میں موجود، آگ تاپتے ہوئے شکاریوں کے ساتھ ساتھ پڑھنے والوں کے ہاتھ ہی نہیں منجمد ہونے لگتے ہیں بلکہ کافی کی خواہش بھی ہونے لگتی ہے۔

تیز بارش میں برساتی نالوں کی وجہ سے سڑک بند ہو جائے تو ڈاک خانے میں پناہ لینے والوں کی پریشانی اور طوفانی بارش کی اس طرح منظر کشی کرتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے ہم خود پھنسے ہوئے ہیں لیکن وہان عمران کی موجودگی سے یہ اطمینان بھی رہتا ہے کہ وہ یہاں سے نکلنے کی کوئی نہ کوئی سبیل کر لے گا۔

(ii)

غرض تیز ہوائوں کے جھکڑ ہوں یا برف باری۔رات کے اندھیرے میں بارش کے شور کے ساتھ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز ہو یا گاڑی کے پہیئے کے نیچے روڑوں کے کڑکڑانے کی آوازیں، قارئین کو سانس روکنے پر مجبور کر دیتی ہیں اور پڑھنے والا اپنے آپ کو اس ہی ماحول میں محسوس کرتا ہے۔منظر کشی کا کمال ہی یہ ہے کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو اس ہی ماحول اور منظر کا حصہ سمجھنے لگے۔ورنہ افق پر چاند اور بہتے ہوئے جھرنوں کا ذکر تو عام ہے۔

ہم چونکہ تحقیقاتی کام دلجمعی سے نہیں کر پاتے اس لیئے ابن صفی کے ایسے چاہنے والوں کو جو لکھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں دعوت دیتے ہیں کہ وہ ابن صفی کی منظر کشی کے حوالے سے ایسے ناول، جن کی ایک دو مثال ہم نے دی ہیں، منتخب کر کے باقاعدہ ناول کے حوالوں کے ساتھ ضبط تحریر میں لائیں۔ہمیں یقین ہے کہ انہیں اتنا مواد مل جائے گا کہ وہ ایک تحقیقاتی مقالہ لکھ سکتے ہیں۔

اوپر دی ہوئی مثالیں ہم نے دو تین ناولوں سے اپنی یادداشت کے بل بوتے پر پیش کر دی اس لیئے ناول کا نام وغیرہ ہم ان تحقیقاتی تجزیہ نگاروں پر چھوڑتے ہیں جو ہمارے مشورے پر عمل کرنے کی ہمت کر سکتے ہیں۔یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ منظر کشی پر ابن صفی نے سنجیدگی سے کبھی کوشش نہیں کی لیکن لگتا یہ ہی ہے کہ یہ منظر کشی ان سے بس سرزد ہو تو گئی لیکن انہوں نے فوراًاس پر بریک لگا دیا کیوں کہ ان کی ساری توجہ کہانی کو دلچسپ، پر تجسس بنانے پر ہوتی تھی ہاں، لیکن انہوں نے کرداری نگاری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور کسی بھی کردار کی تخلیق میں اپنا علم، انسانی نفسیات وجبلت کو ضرور پیش نظر رکھا۔کسی بھی کردار کے منفی یا مثبت پہلو کو اجاگر کرنے میں اس کے ایسا ہونے کی وجہ کو بھی ڈسکس کیا کہ آیا وہ کسی خاص ماحول کے زیر اثر ایسا بن گیا یا اس کی وجہ اس کے ساتھ اس کے اپنوں یا غیروں کا برتائو رہا ہے۔

آج ہم عمران، فریدی، حمید جیسے مرکزی کرداروں کی بجائے چاہتے ہیں کہ دوسرے سپوڑٹنگ کرداروں کے ساتھ ساتھ دو تین منفی کرداروں کی بات کی جائے۔جیسے عمران کی صلاحیتوں سے پوری طرح فیضیاب ہونے والا سپرنٹینڈنٹ کیپٹن فیاض۔خود غرضی اور نرم دلی کا مجموعہ، جو اپنی نااہلی اور اپنے عہدے کی لاج رکھنے کے چکر میں پستا رہتا ہے۔۔اس کے سسر بھی نفسیات کے طالب علموں کے لیئے کافی پر کشش ہیں۔۔زہریلا آدمی اور پرنسز تارا بھی نفرت اور محبت کی انتہا پسندی کی بہترین مثال ہیں۔ایسے بیسیوں کیریکٹر ہیں جو اپنی اپنی نفسیات کی وجہ سے نفرت کے ساتھ قارئین کی ہمدردی کے مستحق ٹھہرے جیسے " لاش کا بلاوہ " میں مجرم بلیک میلر واصف۔" سائے کی لاش " کی بیگم تنویر۔ایسے بیسیوں کردار ہیں لیکن ہم چونکہ اختصار کے عادی ہیں اور " مختصر مختصر ان ہی دو صفحات میں مکمل " کے عادی ہیں اس
لیئے اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ہاں اگر کبھی ہمیں کوئی سیکریٹری میسر آ گیا تو پھر انشااللہ ان کتابوں کے تمام کرداروں اور مناظر پر سیر حاصل بحث ضرور کریں گے ورنہ تحقیقاتی کام کرنے والے قابل استطاعت مصنفین کو ہماری صلائے عام تو ہے ہی۔۔اس لیئے اجازت
لینے سے پہلے دو ایک خصوصی منفی کرداروں کا بھی ذکر کر لیتے ہیں۔۔

ابن صفی نے جہاں ذہنوں سے چپک جانے والے عمران، فریدی، حمید، قاسم، جولیانا، روشی، صفدر وغیرہ دیئے، وہیں ایسے منفی کردار بھی دیئے جن سے اتنی نفرت پیدا ہوتی ہے کہ دل چاہتا ہے ان کا انجام بد سے بدتر ہو اس ہی لیئے جب " اونچا شکار " کے قانوں سے بچ جانے

(iii)

والے مجرم ڈکسن کو فریدی صدر کے باڈی گارڈز کے ذریعے کیفر کردار کو پہنچاتا ہے تو قارئین کا دل چاہتا ہے کہ تالیاں پیٹے۔ڈکسن کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیئے جو طریقہ فریدی نے اپنایا وہ چند سال پہلے بننے والی بھارت کی فلم میں استعمال ہوا۔

غیر ملکی ایجنٹ جو ملک کو نقصان پہنچانے کے درپے ہوتے ہیں تو ان کے انجام پر بھی خوشی محسوس تو کی جاتی ہے لیکن ابن صفی کے دو منفی کردار ایسے بھی ہیں جن کی گرفتاری تو ہر قاری چاہتا ہے لیکن موت نہیں۔۔یہ تھریسیا اور سنگ ہی ہیں جن کے لیئے قارئین ہی نہیں خود عمران کے دل میں بھی نرم گوشہ ہے اور یہ بھی یک طرفہ نہیں کیونکہ یہ دونوں مجرم بھی عمران کو رعایت دیتے رہے ہیں جس کی بہترین مثال وہ سچویشن ہے جب سنگ ہی کے ساتھیوں کے ہاتھوں عمران کی موت کا سن کر وہ صدمے اور غصے میں اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کر دیتا ہے۔جہاں عمران کے ہاتھوں بھاری نقصان اٹھانے کے باوجود سنگ ہی اور تھریسیا طرح دے جاتے ہیں وہیں فرائض کی ادائیگی میں ان دونوں کو ہتھ کڑی پہنانے اور قانون کے حوالے کرنے کے باوجود ان کے جیل سے فرار ہونے پر عمران کو دکھ نہیں ہوتا۔

اختصار سے کام لینے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم ابن صفی کی ایک اور خصوصیت کا ذکر نہ کریں کیونکہ وہ بھی بہت اہم ہیں۔انہوں نے دونوں سیریز میں ایسی دو دنیائوں کو تخلیق کیا ہے جو ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ان میں موجود کلب، ہوٹل اور ریستوران اس طرح نظر آتے ہیں کہ معلوم ہو جاتا ہے یہ عمران کے شہر ہیں یا فریدی کے۔عمران اور فریدی دونوں اپنے اپنے ملکوں کے دارالحکومت میں رہتے ہیں اور ان کے قرب وجوار میں ٹیکم گڈھ، رام گڑھ، تار جام، شاداب نگر کے علاوہ جھیلیں، جنگل اور پہاڑی سلسلے اس طرح سامنے آتے ہیں کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو ان سے مانوس سمجھتا ہے۔۔وہ نیاگرہ جیسے بڑے ہوٹل، ٹپ ٹاپ یا ہائی سرکل نائٹ کلب آرلکچنو بلکہ رائیفل کلب تک میں خود کو اجنبی محسوس نہیں کرتا۔بلکہ یوں محسوس کرتا ہے جیسے اس کا رات دن کا اٹھنا بیٹھنا ان ہی بڑے ہوٹلوں میں ہے جہاں کیبرے، والز، چاچاچا، وغیرہ کے ساتھ ساتھ وہسکی، بوربن، شیمپین ہی نہیں ملتی بلکہ نیس کیفے اور پولسن کافی کی خوشبو بھی سونگھنے کو مل جاتی ہے۔اتنی آسانیوں کے باوجود قارئین کا دل شراب کی طرف راغب نہیں ہوتا کیونکہ ان کے محبوب عمران اور فریدی اسے مونہہ لگانا پسند نہیں کرتے اور یہ ہی ابن صفی کی کامیابی ہے کہ جرائم کی دنیا میں بھی وہ قارئین کو قانون کی حدود میں ہی رکھتے ہیں۔۔اور کہانی کو اس طرح پروان چڑھاتے ہیں کہ پڑھنے والا مجرم سے نفرت محسوس کرتا ہے اور خود کو قانون کے رکھوالے کا ساتھی سمجھتا ہے۔۔

نوٹ۔اگر کبھی ہماری یونی ورسٹیز کو توفیق ہوئی اور ابن صفی پر ڈاکٹریٹ دینے کا خیال آیا تو طالب علموں کو یہ دو موضوعات فوراً دستیاب ہونگے۔۔

(1)ابن صفی کے کردار ۔(2) ابن صفی کی منظر کشی

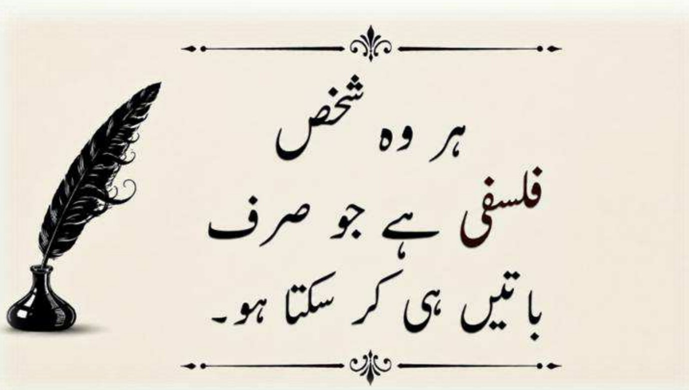

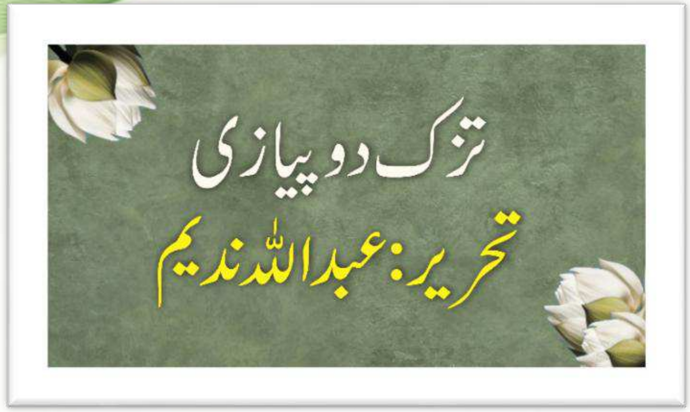

ابن صفی، اسرار ناروی، طغرل فرغان، سنکی سولجر، اتنے سارے ناموں کے ہجوم میں آپ کا دل کس کے لیے دھڑکتا ہے؟ اس بات سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا، کیونکہ یہ سب ایک ہی شخص کے روپ بہروپ ہیں. ہاں ابن صفی والا روپ زیادہ مشہور ہے۔ اب اگر اسرار ناروی کو بیچ سے نکال دیں کہ وہ ایک علیحدہ شخصیت ہے، تو حقیقت یہ ہے کہ ابن صفی کو ابن صفی بننے کے لیے طغرل فرغان اور سنکی سولجر سے ہو کر گزرنا پڑا۔ اور اگر آپ نے ہماری طرح متعلقہ کالمز کو پڑھا ہے، تو آپ نے مشاہدہ کیا ہو گا کہ ان میں ابن صفی کے اولین نقوش واضح طور سے دکھائی دیتے ہیں، بالخصوص جملوں کی برجستگی اور ابن صفی کا مخصوص طنزیہ اندازِ بیان ۔

"میں اس سے ملا" یہ کالم ابن صفی نے سنکی سولجر اور طغرل فرغان کے مشترکہ نام سے لکھا ہے اور یہ ایک ایکٹریس کا انٹرویو ہے۔ اس سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

"آپ اتنی خوبصورت کیوں ہیں" میں نے دانتوں میں انگلی دبا کر شرماتے ہوئے پوچھا

"جی میں صبح روز سن لائٹ صابن کھاتی ہوں"

"میں ایک بات پوچھوں، برا تو نہ مانیں گی"

"شوق سے پوچھیے"

"آپ نے بہت ساری شادیاں کیوں کی ہیں"

"بات دراصل یہ ہے کہ" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی "مجھے کتوں سے زیادہ شوہر پسند ہیں"

"یہ کیوں"

"کتے بھونکتے بھی بہت ہیں اور کبھی کبھی کاٹ بھی لیتے ہیں"

"کیا آپ کسی شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہیں"

"جی ہاں"

"کیا آپ کے والدین زندہ ہیں"

"وہ کیا کرتے ہیں"

"بچے پیدا کرتے ہیں"

"آپ کتنے عدد بچے پیدا کر چکی ہیں"

"سولہ عدد"

ابن صفی کی کئی جاسوسی کہانیاں فلمی دنیا کے ارد گرد گھومتی نظر آتی ہیں اور اس نوعیت کے بہتیرے مکالمات آپ کو وہاں مل جائیں گے۔ گمان غالب ہے کہ ان کہانیوں کے سیٹ اپ اور مکالمات کی بنا یہیں ڈالی گئی ہے۔

ابنِ صفی نے اپنے اوپر جو سب سے بڑا ظلم کیا، وہ یہ ہے کہ بحیثیتِ ابن صفی انھوں نے جس معیار کی جاسوسی کہانیاں لکھیں، اس کے تلے بحیثیت اسرار ناروی اور طغرل فرغان ان کی شخصیت دب گئی، یہاں تک کہ "پرنس چلی" اور "تزکِ دوپیازی" جیسے شاہکار بھی عموماً دنیا کی نظروں سے اوجھل رہ گئے۔

آپ نے بادشاہوں کی خود نوشت پڑھی ہوں گی*۔ تاریخی نسبت کے سبب تزکِ بابری اور تزکِ جہانگیری بہت مشہور ہوئیں۔ ابن صفی نے لیک سے ہٹ کر ایک عوامی کردار "ملا دوپیازہ" کی تزک لکھی اور اپنے کردار کو حیاتِ جاوداں بخش دی۔ دیکھیے اس کے دیباچے میں وہ کیا لکھتے ہیں

"بادشاہوں کی تزکیں آپ نے پڑھی ہوں گی۔ یہ ملا دوپیازہ جیسے عوامی کردار کی تزک ہے، جس کی طرف کسی نے بھی توجہ نہیں دی تھی"

اس تزک کا زمانہ اکبر کا عہد ہے اور اس کا ہیرو

ابوالحسن عرف ملا دوپیازہ ہے جو اپنے مفقود الخبر باپ کی تلاش میں اکبر آباد کی طرف کوچ کرتا ہے کہ "زمانے کے دستور کے مطابق زوجاؤں سے ڈر کر بھاگنے والے ادھر کا ہی رخ کرتے ہیں اور شاہی لشکر میں بھرتی ہو جاتے ہیں۔ ایک مرد بزرگ نے تو یہاں بتایا کہ مرہٹوں کی فوج میں ایسوں کو سپہ سالار بنا دیا جاتا ہے"

گو کہ اس تزک میں تخت نشینی، لاؤ لشکر، فتوحات، محلاتی زندگی، بیگمات اور سامان تعیش کا ذکر نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود یہ تزک زیادہ دلچسپ ہے، کیونکہ ایک عام آدمی کی زندگی زیادہ طلسماتی ہوتی ہے۔ یہاں عہد اکبری کی وہ تصویر دکھائی دیتی ہے جسکی جھلک شاہی تزک میں نہیں ملے گی۔ مزید برآں سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی بھی اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔ ابن صفی نے اپنے جاسوسی ناولوں میں تھریسیا اور نانوتہ جیسی طاقتور اور ریشہ دوانیوں میں ماہر عورتوں کے کردار تخلیق کیے ہیں لیکن وہ "نسترن بانو" کے سامنے پانی بھرتی نظر آتی ہیں ۔ اسکی شیطانی کھوپڑی نے جو گل کھلائے ہیں اور جس طرح اس نے ملا دوپیازہ کو تگنی کا ناچ نچایا ہے، اس کی مثال ملنی ہے مشکل ہے۔

تزک کی شروعات داستانوی انداز سے ہوتی ہے۔ ابتدا میں زبان و بیان پر "طلسم ہوشربا" کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ ابن صفی نے لکھا بھی ہے کہ انھوں نے آٹھ سال کی عمر میں "طلسم ہوشربا" ختم کر لی تھی اور جب بھی وہ کچھ لکھنے بیٹھتے تو وہ آٹھ سال کا بچہ سامنے آکر کھڑا ہو جاتا۔ دیکھیے یہ داستان کیسے شروع ہوتی ہے

"رہے نام اللہ کا اور اس کے محبوب (ص) کا۔ ان دوناموں کے علاوہ اور ہر نام فانی ہے اور ان اسمائے پاک کے علاوہ کسی اور نام کی کوئی حیثیت نہیں۔ نام بدلا، حیثیت بدلی، پتہ نہیں میرا اصلی نام کیا تھا۔ اس نام کے ساتھ کچھ اور تھا۔ جب ملا دوپیازہ کہلایا تو کچھ اور ہو گیا۔ میرا باپ میری صغر سنی میں ہی مفقود الخبر ہو گیا تھا۔ ذرا ہوش سنبھالا تو یہ دیکھ کر بڑی کوفت ہوئی کہ باپ نہیں ہے۔ مر چکا ہوتا تو صبر آ جاتا۔

سب سے زیادہ قلق اس بات کا تھا کہ کسی کا کچھ لے کر نہیں بھاگا تھا اور نہ اس فرار میں کسی محبوب دل آرا کی چاہت کار فرما تھی۔ پڑوسیوں سے روایت ہے کہ میری مادر محترمہ کی زبان بے لگام کا کشتہ تھا۔ ایک دن بازار سے روغنِ زرد کا ہنڈا سر پر رکھے گھر کی جانب پلٹ رہا تھا کہ نزلے کی تحریک ہو کر چھینک آئی۔ ہنڈا سر سے مراجعت کر کے سوئے زمین آیا اور پاش پاش ہو گیا۔ نقصانِ مایہ کہ تقدیری امر تھا، صبر کیا جا سکتا تھا لیکن پدرِ بزرگوار شماتتِ مادر محترمہ کی تاب نہیں رکھتا تھا، پھر پلٹ کر گھر نہیں آیا"

اردو کی داستانوں میں بقول مشتاق احمد یوسفی "سوداگروں کا ذکر اگر کہیں آتا ہے تو وہ محض قزاقوں سے لٹنے کے لیے۔ اور یہ بھی اس طور پر کہ پڑھنے والے کی اخلاقی ہمدردی ہمیشہ لوٹنے والے کے ساتھ رہتی ہے"

ابوالحسن عرف ملا دوپیازہ نے بھی جب اکبر آباد کے لیے عزم سفر باندھا تو ایک سوداگر ثناء اللہ پارچی کے قافلے میں شامل ہو گیا۔ یہ سوداگر بھی انھیں صفات کا حامل تھا جو ہماری داستانوں میں بیان ہوئی ہیں۔ قافلے میں ساز و سامان کے ساتھ سولہ عدد طرح دار کنیزیں بھی تھیں، جن کی حفاظت کے لیے دانستہ بوڑھے سپاہی رکھے گئے تھے کہ وہ

کنیزوں کے لیے خطرہ نہ بنیں۔ تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ قافلوں کا لٹنا اس زمانے میں عام تھا سو یہ قافلہ بھی لٹا، لیکن اس کے ساتھ ہمارے ہیرو کی تقدیر بھی بدلی ۔ حملے میں ملک التجار اور ابوالحسن کے علاوہ تمام لوگ مارے گئے۔ اس زمانے کے رہزن لوٹ پاٹ کے ساتھ نماز روزہ بھی کیا کرتے تھے۔ آج بھی صورتحال کچھ بدلی نہیں ہے ،بس رہزنوں کی شکلیں بدل گئی ہیں۔ لوٹ مار کے بعد جب نماز کا وقت ہوا تو رہزنوں کے سردار نے باقاعدہ امامت بھی کی اور نماز ختم ہونے کے ابوالحسن اور ثناء اللہ پارچی سے ڈپٹ کر پوچھا کہ انھوں نے نماز کیوں نہیں پڑھی۔ ہمارے ہیرو نے بغیر ڈرے ہوئے کہا کہ " دیدہ ودانستہ مکھی نہیں نگلی جاسکتی، کسی لٹیرے کے پیچھے نماز درست نہیں ہوتی "کب کونسا فقرہ کس کی زندگی کہاں بدل دے گا، اس کا علم صرف کاتبِ تقدیر کو ہے۔ ابوالحسن کی قسمت بھی بدلنے والی تھی۔ یہ جملہ سننا تھا کہ سردار پیروں پر گر کر بولا کہ "یاحضرت میں اسی توقع پر لوٹ مار کیا کرتا تھا کہ کبھی نہ کبھی کسی ولی کامل سے ضرور ملاقات ہوگی، سو اب میری طرف توجہ دیجیے کہ میرا آئینہِ دل دہر کی ناپاکیوں سے صاف ہو جائے"

حالات کا جبر انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ ابوالحسن کے خواب وخیال میں نہیں رہا ہوگا کہ ایک دن اسے ولی قرار دے دیا جائے گا۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہتا ہے اور وہ اس جبری ولایت کے جال سے نکلنے کی پوری کوشش کرتا ہے، لیکن نسترن بانو اس کی تمام کوششوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔ "تریاچلتر "اس پر ختم ہے اور شیطان بھی اس سے پناہ مانگتا ہے۔ وہ ابوالحسن کی زندگی میں کیسے آئی، اس کی کہانی بھی دلچسپ ہے۔ گئے تھے نماز بخشوانے، روزے گلے پڑ گئے۔ اس کا جن تو اتر گیا لیکن وہ جونک کی طرح چمٹ گئی۔ شروع میں یہ عورت جس قدر بھولی اور بے ضرر لگتی ہے، کہانی میں آگے اس کی شیطانی کھوپڑی نے جو گل کھلائے ہیں، اس کے آگے ابلیس بھی شرما جائے۔ وہ اس تزک کا سب سے جاندار کردار ہے اور اس کا شمار ابن صفی کے لازوال کرداروں میں کیا جاسکتا ہے۔

ابن صفی نے تھکے ہوئے ذہنوں کے لیے تفریح کا سامان ضرور فراہم کیا ہے، لیکن محض ذہنی عیاشی کبھی بھی ان کی تحریروں کی محرک نہیں رہی۔ وہ ایک صالح معاشرے کی تشکیل چاہتے تھے۔ اس تزک کو بھی محض پیروڈی سمجھ کر نہیں پڑھنا چاہیے۔ اس کے ذریعہ ایک طرف تو انھوں نے عوام کی سادہ لوحی، توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی پر چوٹ کی ہے، وہیں دوسری طرف نقلی درویشوں اور جھوٹے پیروں، فقیروں کی جعل سازیوں کو بھی طشت از بام کیا ہے۔ تصوف نے ہندوستان میں اسلام کو اندر سے کتنا کھوکھلا کیا ہے اور کس طرح سے ہندوانی رسم ورواج نے شکلیں بدل کر اس چشمۂ صافی کو مکدر کیا ہے، اس پر ایک اقتباس دیکھیے۔

"اور میں سوچنے لگا کہ بتائے گی کیا۔۔ مجمع ابھی برخواست ہو گا؟ ابھی تو محفلِ سماع منعقد ہوگی۔۔ ہندؤں کے بھجن کیرتن کی خوب نقل اتاری ہے۔۔ بغداد میں ہوتے یہ لوگ تو زندہ دفن کر دیے جاتے۔۔ طبلے اور سارنگی پر اللہ اور اس کے رسول کا نام الاپتے ہیں۔ یہ امیر خسرو بھی عجیب چیز تھے، اسلام تک کو مقامی رنگ دینے کی کوشش کر ڈالی تھی ۔۔ لیکن علماء کرام کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور تو اور محمد تغلق، جو شریعت کا بے حد پابند تھا، اس کے دور میں اس بدعت نے رواج پایا"

مزارات اور درگاہیں کس طرح وجود میں آتی ہیں، ایک واقعے کے ذریعہ دیکھیے کس خوبصورتی سے اس جعل سازی سے پردہ اٹھایا ہے۔ ابوالحسن اور نسترن بانو کے گلے ایک لاش پڑ گئی تھی، اس کو ٹھکانے لگانے کے بعد، اس کی قبر کو نسترن بانو نے کس طرح ایک نقلی شہید کے مزار میں بدل دیا، اس میں " اولوالابصار "کے لیے سامانِ عبرت ہے ۔ اقتباس دیکھیے

"میں پسینے سے شرابور تھا۔ چادر بچھا کر قبر کے قریب ہی لیٹ گیا۔ ایسی تھکن محسوس ہو رہی تھی کہ بس۔۔۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ اب کہاں اور کیسے رات گزرے گی، الجھن ہونے لگی تو اٹھا اور اپنی گٹھری رتھ سے اتارنے لگا، مجھے یاد آگیا کہ گٹھری میں کچھ اگربتیاں رکھی ہوئی تھیں، کیوں نہ ان میں سے کچھ سلگا کر قبر پر لگا دی جائیں۔

تھوڑی دیر بعد تین دیہاتی اپنے کاندھوں پر بڑے بڑے لٹھ رکھے اسی طرف آتے دکھائی دے اور میں ہونقوں کی طرح قبر کے قریب ہی بیٹھا رہ گیا۔ قریب پہنچ کر وہ رکے اور حیرت سے اس قبر کو دیکھنے لگے۔ پھر میری طرف دیکھا۔ مجھ میں اتنی تاب نہیں رہی تھی کہ ان سے آنکھیں بھی ملا سکتا تھا۔ بس آنکھیں بند کیں اور بیٹھے بیٹھے جھومنے لگا ۔ مجذوبوں کی شکل تو پہلے سے بنی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا اسی طرح سوال وجواب سے بچ جاؤں گا۔

دفعتاً میں نے نسترن بانو کی آواز سنی " ارے بدبختو!اس طرح کیوں کھڑے ہو، شہید میاں رجب شاہ کے مزار شریف پر فاتحہ پڑھو"!

میں نے بوکھلا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ تینوں نسترن بانو کی طرف متوجہ ہو گئے اور نسترن بانو مجھ سے بولی" پیر سائیں!ذرا دیکھیے تو کیا یہ تینوں وہی تو نہیں ہیں؟"

میں نے بوکھلا کر سوچے سمجھے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا

"ڈرو نہیں "! نسترن بانو ان سے بولی" تم بڑے خوش نصیب ہو کہ پیر سائیں کے خواب میں آئے تھے اور پھر میں نے بھی تمہیں خواب میں دیکھا تھا۔ تم نے ہمیں خواب ہی میں بتایا تھا کہ اس جگہ میاں رجب شاہ مدفون ہیں"

ایک دیہاتی ہکلا ہکلا کر کہنے لگا کہ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ نسترن بانو تڑسے بولی" پیر سائیں کو خواب میں ہدایت ہوئی تھی کہ شہید میاں رجب شاہ کی قبر پر مٹی چڑھا دیں کیونکہ تین سو سال میں قبر زمین کے برابر ہو گئی ہے۔ میاں رجب شاہ تین سو سال پہلے شہید ہوئے تھے اور یہیں دفن کیے گئے تھے۔ یہ جگہ ہم کو خواب میں دکھائی گئی تھی اور تم تینوں بھی موجود تھے، تم نے ہی بتایا تھا کہ شہید میاں اس جگہ دفن ہیں"

دیہاتیوں نے لٹھ زمین پر ڈال دیے اور جھک جھک کر میرے ہاتھ چومنے لگے"۔

یہ اس تزک کا ایک پہلو ہے لیکن اس کا اصلی لطف اس کی " ادبیت " میں ہے۔ جملوں کی شگفتگی اور برجستگی تو ابن صفی کے قلم کا خاصہ ہے ہی، لیکن انھوں نے " تزک دو پیازی "میں جس طرح اپنے خامے سے نشتر کا کام لیا ہے، اور جیسے نکیلے، کاٹ دار اور طنزیہ فقرے تراشے ہیں، وہ شاید اردو ادب میں طنز و مزاح کے ادیبوں کے یہاں بھی نہ ملیں۔

تعلقات زن و شوہر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت خوب لکھا گیا ہے۔ ملا دو پیازہ اپنے مفقود الخبر والد کو کیوں تلاش کرنا چاہتا تھا، اس پر ایک اقتباس دیکھیے۔

"جب میں اس قابل ہوا کہ اس داستانِ روح فرسا کو مع سیاق و سباق گوشِ حقیقت نیوش کی اذیت کا سامان بنا سکوں تو مادرِ محترمہ کے عتاب کی پروا کیے بغیر میں نے بھی مفقود الخبری کی ٹھان لی، لیکن حاشا و کلا اس میں مادرِ محترمہ کی طرف سے بے زاری کا شائبہ نہیں تھا۔ میں تو پدرِ بزرگوار کو تلاش کر کے یہ اطلاع دینا چاہتا تھا کہ چنگیز بھی بیوی سے ڈرتا تھا لیکن کبھی اس طرح پیٹھ نہیں دکھائی تھی۔ میدانِ جنگ میں کشتوں کے پشتے لگا کر بیوی کے آگے بیٹھا گھگھیایا کرتا تھا، اور قول اس جواں مرد کا یہ تھا کہ وہ مرد ہی نہیں جو اپنی زوجہ سے ڈرتا نہ ہو"

ملا کو اس کی ماں نے باپ کی کیا پہچان بتائی تھی؟ اس پر بھی ایک فقرہ دیکھیں۔ جب ثناء اللہ پارچی اس سے پوچھتا ہے کہ اے پسر تیرا باپ تو صغر سنی میں گھر چھوڑ کر جا چکا تھا، تو اسے کیسے پہچانے گا؟ ملا کا جواب ---

"میں نے کہا شکل تو یاد نہیں لیکن مادرِ محترمہ نے خاص پہچان بتائی ہے۔ پھر اس کے استفسار پر میں نے بتایا۔ پہچان یہ بتائی کہ اگر کان ذرا بڑے ہوتے تو بالکل گدھا معلوم ہوتا ۔ یہ کلام سن کر ثناء اللہ پارچی بے اختیار رونے لگا اور میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ خداوندا یہ کیا۔ جب وہ جی بھر کر رو چکا تو بولا" اے فرزند! یہ تو کوئی خاص پہچان نہ ہوئی، جس کی زوجہ سے جی چاہے جا کر پوچھ لے، اس کے شوہر کی پہچان خدا نے چاہا تو یہی بتائے گی"

صنف نازک کہی جانے والی عورت نے مرد کو اپنی انگلیوں پر نچایا ہے، یہ ایک آفاقی حقیقت ہے، اب ذرا ملا کی زبان سے یہ درد بھری داستان سنیں

"ہائے کس مصیبت میں پھنس گیا۔ کیسی درگت بنا رہی ہے۔ خوش قسمت تھا اس کا شوہر جس کا پیچھا خود اسی نے چھوڑ دیا تھا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ روحانی معالج بن کر میں خود اپنی روح کو شیطان کے حوالے کر رہا ہوں۔ چڑیل کی طرح چمٹ گئی ہے۔ بچپن میں جب کبھی میں اپنے سر میں خوشبودار تیل ڈالنے کی ضد کیا کرتا تھا تو میری ماں کہتی تھی " ارے باؤلا ہوا ہے۔ بچے سر میں خوشبودار تیل ڈالتے ہیں تو چڑیل چمٹ جاتی ہے۔"اے میری ماں تیرے اس قول نے مجھے جوانی میں بھی خوشبودار تیل کے استعمال سے باز

رکھا۔ پھر یہ چڑیل کیسے چمٹ گئی۔ اب میں کیا کروں؟ کس پیر سے اپنی جھاڑ پھونک کراؤں، کس سیانے سے تعویذ لوں کہ اس نے خود مجھے ہی پیر بنا دیا ہے اور مزید بناتی چلی جاتی ہے"

مرد عورت کے نخرے کیوں اٹھاتا ہے، اس سوال کا جواب ذرا عرب کلچر کے حوالے سے ملاحظہ فرمائیں

"تم کس نسل سے تعلق رکھتی ہو"

"میں تو مغل بچی ہوں"!

خدا کا شکر ہے کہ میں مغل بچہ نہیں ہوں ورنہ تمہاری گردن کب کی اڑا چکا ہوتا"

"پھر آپ کیا چیز ہیں" وہ اوپری ہونٹ بھینچ کر بولی

"نسلاً عرب ہوں اور عرب عورتوں کے نخرے برداشت کرنے کے سلسلے میں ساری دنیا میں شہرت رکھتے ہیں"

"تبھی تو اونٹ کی مینگنی سی شکل نکل آئی ہے"

عشق حقیقی اور عشق مجازی کی ذرا یہ تشریح ملاحظہ فرمائیں۔ فیض الحسن نام کا ایک مفلوک الحال شخص ابو لحسن عرف ملا دو پیازہ سے" سلوک" کی منازل طے کرنے کے لیے بیعت ہوتا ہے۔ اب اس کا سوال دیکھیے اور اس میں چھپے ہوئے طنز کو محسوس کیجیے

"میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آپ عشق مجازی سے عشق حقیقی تک پہنچے ہیں یا براہِ راست پہنچ گئے ہیں"

"اب اس بکواس کا مطلب بھی بتا"

"دریدہ دہنی کی معافی چاہتے ہوئے عرض کروں گا کہ بسا اوقات کسی کمتر درجے کے آدمی کو کسی دولت مند کی بیٹی سے عشق ہو جاتا ہے۔ برسوں اس کے چکر میں سرگرداں رہتا ہے۔ جب وہ نہیں ملتی ہے تو کھٹ سے معشوق حقیقی سے رجوع لاتا ہے اور ہمہ اوست کا دم بھرنے لگتا ہے"

اسی فیض الحسن کی زبانی مثنوی نگاری پر طنز دیکھیے۔ مفلوک الحال فیض الحسن کو گاؤں کے مکھیا کی لڑکی سے عشق ہو جاتا ہے

"میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ غریب آدمی محبت کے معاملے میں بھی چور ہوتا ہے، جس سے محبت کرتا ہے، اسے پتہ نہیں چلنے دیتا کہ محبت کر رہا ہے"

"میں سمجھ گیا۔ تیرا مشغلہ بھی یہی ہے"

اس نے کچھ کہنے کے بجائے سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا" غریب آدمی کے محبت کا اظہار ہو جائے تو وہ بری طرح مار کھاتا ہے، لیکن اگر کوئی سوداگر بچہ محبت کر بیٹھے تو بڑی بڑی مثنویاں لکھ دی جاتی ہیں جنھیں ایک زمانہ سنتا ہے اور اپنے ہی سر دھنتا ہے"

ابن صفی کو دنیا سے گئے چار دہائیوں سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، اتنی مدت میں تو کوئی بھی ادیب عوام الناس کے ذہن اور پڑھنے والوں کی یادداشت سے عموماً نکل جاتا ہے یا فی زمانہ اس کی افادیت باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ ابن صفی کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ان کے پرستاروں اور چاہنے والوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس مقبولیت اور کشش کے پیچھے کئی اسباب کارفرما ہیں، جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں" اخلاقیات "کو مطمح نظر تو بنایا لیکن" ادبیت" کا دامن کبھی نہیں چھوڑا اور اس لحاظ سے وہ اقبال کے مماثل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کی کتابیں مطالعے کی میز پر یا تکیے کے نیچے پائی جاتی ہیں۔

ابن صفی کے علامتی کردار

مرزا صہیب اکرام

کہانی میں کردار ہوتے ہیں جو اسے زندگی اور تابندگی عطا کرتے ہیں۔ کہانی کے بہت سے اجزاء مل کر اسے بہتر، بہترین لازوال اور لافانی بناتے ہیں اور ان تمام اجزاء کو قارئین تک کہانی کے کردار پہنچاتے ہیں۔۔ یہ کردار ہی ہوتے ہیں جو کہانی میں فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ بڑی کہانی تبھی بنتی ہے جب کردار بڑے ہوتے ہیں۔

دنیا کے ہر ادب میں لوگ مصنفین کے نام بھول جاتے ہیں، کہانیاں ذہنوں سے محو ہو جاتی ہیں پلاٹ یاد نہیں رہتے لیکن کردار نہیں بھولتے۔

کردار قارئین کو کئی وجوہات کی بنا پر یاد رہتے ہیں۔ کبھی وہ انسان کو معاشرے کا عکس نظر آتے ہیں کبھی وہ اسے حقیقت سے تخیل کی دنیا میں لے جاتے ہیں اور کبھی وہ اسے خیال سے تلخ حقیقت کی دنیا دکھا دیتے ہیں۔ کردار نگاری کہانی کا وہ عنصر ہے جو کہانی کی عظمت کو گہرائی عطا کرتا ہے۔ کبھی کسی کہانی میں ایک ٹیکسی ڈرائیور قارئین کو فلسفہ سکھا دیتا ہے کبھی ایک عام آدمی زندگی کا سب سے بڑا درس دے جاتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مصنف کردار کے ذریعہ معاشرے کے تلخ ترین مسائل پر سوال کھڑے کرتا ہے۔

کبھی کرداروں کے ذریعے وہ ہنساتا ہے اور کبھی رلاتا ہے۔

کبھی کردار ظالم ہوتے ہیں کبھی مظلوم بن جاتے ہیں۔ لیکن ہر کردار میں مصنف کا دکھ، درد تکلیف، خواہش، خیال، امید مایوسی، سچائی، خواب اور خیال بولتے ہیں۔

مصنف کہانی میں کردار پیش کرتے ہوئے انہیں سماج کی تنگ و تاریک گلیوں اور ننگ و بے نام محلوں سے چکر لگوا کر لاتا ہے وہ انہیں دکھ درد کی گہرائیوں سے نکال کر لاتا ہے ۔وہ انہیں پاتال سے اٹھالاتا ہے اور انہیں خیالی آسمان سے تراش لاتا ہے۔ وہ زندگی کے سفر سے کسی گلی کی نکڑ، کسی چوبارے, کسی گلیارے، کسی موڑ، کسی سڑک، کسی پارک، کسی کوٹھری، سے اٹھا کر کوئی کردار قارئین کے سامنے زندہ کر دیتا ہے۔

وہ موت کے تختے سے اور تخت سے کردار کو جلا بخشتا ہے وہ لفظوں سے علامتوں سے، درد و خوشی کی کیفیتوں سے کردار بُنتا ہے اور معاشرے کا عکس پیش کرتا ہے وہ ان کو نئے نام دیتا ہے نئے انداز بخشتا ہے وہ انہیں زندہ کرتا ہے اور معاشرے کے بدنما چہرے کو آئینہ دکھا دیتا ہے وہ کرداروں کی ڈور اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے لیکن وہ ہر کردار کے ساتھ خود بھی ہنستا اور روتا ہے۔ وہ کسی کو زندہ رکھتا ہے اور کسی کو مار دیتا ہے لیکن ہر کردار کے ساتھ وہ خود بھی تھوڑا تھوڑا مرتا رہتا ہے۔

ایسے کردار تراشنے والا گوہر یکتا ہوتا ہے دنیا کے ہر ادب میں ایسے مصنفین گزرے ہیں جو اپنے قلم سے کسی کمرے کی چارپائی پر دنیا کے عظیم کردار تخلیق کر جاتے ہیں لیکن ایک مصنف ایسا بھی ہے جس نے سماج کی مٹی سے کردار اٹھائے اور سینکڑوں کرداروں کو جنم دیا۔ اس کا کردار معاشرے کا عکس تھا وہ اپنے کرداروں کو معاشرے کے ہر زخم کا مرہم بنایا ہے اور وہ معاشرے میں اپنے کرداروں سے امید بھی بخشتا تھا۔ وہ نام ابن صفی کا تھا

جس نے ایک نہیں سینکڑوں کردار تراشے اور ان کا ہر کردار نا صرف ان کے معاشرے کا عکس تھا بلکہ وہ دنیا جہان کی تہذیبوں، انسانی ارتقاء، تہذیبی تصادم، عصبیتوں، اور تاریخی ظلم و جور کو سمجھتے تھے اس وجہ سے ان کے کردار کسی سرحد تک محدود نہیں تھے وہ ساری دنیا سے تھے۔۔

ادبی دنیامیں کردار کی اہمیت دوہری ہوتی ہے وہ کہانی کی ضرورت ہوتے ہیں اور ان سے کہانی میں اچھائی اور برائی کا تصور واضح ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ کردار بلند پایاں تصور اور تہذیب کی علامت کے طور بھی بیان ہوتے ہیں۔ایک کردار میں شخصی سے سماجی ماڈل تک نظر آتا ہے وہ اپنی ذات سے کسی قوم یا مخصوص دور یا حالات کا عکاس بھی ہوتا ہے۔وہ کردار کبھی صورتِ طنز بیان کیا جاتا ہے اور کبھی انسان کے اجتماعی ضمیر پر کاری ضرب کی طرح ہوتے ہیں۔کہانی کار اپنے قلم کی طاقت سے کردار تراشتے ہیں اور پھران سے سماج پر چوٹ کرتے ہیں اور آنہیں نیکی اور بدی کو دو حصوں میں منقسم کر کے قارئین کو پیغام دیتے ہیں ان کی ذہنی آبیاری کرتے ہیں ان کے مردہ ضمیروں کو جھنجھوڑتے ہیں ان کے بند ذہنوں کو تابندگی عطا کرتے ہیں۔

عالمی ادب میں علامتی کردار

کرداروں کی ایک مخصوص تکنیک علامتی کردار کہلاتی ہے۔مصنف ان علامتی کرداروں کو مختلف انداز میں کہانی کی گہرائی بڑھانے اور اپنا پیغام پہنچانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ان کی کئی اقسام ہوتی ہیں۔

1۔علامتی کردار کی پہلی قسم ہے روایتی اور یونیورسل کردار جو ایک مخصوص پیٹرن کے مطابق ہوتے ہیں اور انسانی نفسیات کی فطری علامت بن جاتے ہیں۔۔مثلاہیر و وہ کردار ہوتا جو بہادری، حوصلہ، قربانی اور اپنی ذات کی تلاش کی علامت ہوتا ہے جیسے یونانی اساطیر کا کردار اودیسوس

دوسری مثال سرپرست یا mentor کا کردار یہ فہم، شعور اور راہ نمائی کی علامت ہوتا ہے جیسے لارڈ آف رنگ کا کردار گینڈالف۔

2۔ علامتی کردار کی دوسری قسم ہے تشبیہ اور شخصیاتی کردار ہیں۔ تمثیلی کاموں میں، کرداروں کو حقیقت پسندی سے دور کر دیا جاتا ہے اور وہ کسی مخصوص تجریدی خیالات، برائیوں یا خوبیوں کی نمائندگی کرنے کے لیے کام کرتے ہیں۔

مثلاولیم گولڈنگ کے " لارڈ آف دی فلائیز "میں، پگی کا کردار منطق اور عقل کی علامت کہا جاتا جب کہ جیک کا کردار بنیادی طور وحشییت اور لامحدود طاقت کی بھوک کا استعارہ ہے۔

3۔ اگلی قسم سماجی اور ثقافتی تصورات کو مجسم کرتے کرداروں کی ہے۔ایسے کردار اس دور کی مشکلات، مخصوص حرکات یا تبدیلیوں کی نمائندگی کرتے ہیں جس میں وہ لکھے گئے تھے۔

اس کی مثال F. Scott Fitzgerald's The Great Gatsby سے جے گیٹسبی ہے جو امریکی خواب کے تعاقب، دولت کے بھرم،اور مادیت کے خالی پن کی علامت ہے۔

4۔ علامتی کردار کی چوتھی قسم متضاد کردار ہیں۔اس تکنیک میں کردار کی علامتی نوعیت صرف دوسرے کے تضاد کے باعث محسوس کی جاتی ہے۔ایسے کردار جو دو مخالف نظریات یا موضوعات کے درمیان تصادم کو اجاگر کرتے ہے۔

اس کی مثال میری شیلی کی فرینکنسٹین میں، وکٹر فرینکنسٹائن کا کردار ہے اخلاقی ذمہ داری کے بغیر خطرناک حد تک علم کے حصول کی علامت ہے جب کہ اس کا خالق کردار معاشرے کی طرف سے بگڑی ہوئی انسانی فطرت کی خالص حالت کی نمائندگی کرتا ہے۔

5۔علامتی کرداروں کی آخری قسم وہ ہے جس میں محرکات اور نام سمبل کے طور ہو اور کرداروں کی نام یا ان سے جڑی ہوئی جسمانی / رویے کی خصلتیں بھی علامتی ہو سکتی ہیں جو براہ راست کردار کے موضوع یا کسی خفیہ نوعیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

اس کی مثال To Kill a Mockingbird :میں "Aticus" نامی کردار کا انتخاب ایسی کلاسیکی قدیمیت اور سالمیت کو ظاہر کرتا ہے ہے جو ایک متعصب معاشرے میں انصاف اور اخلاقیات کی اٹل آواز بنا ہے۔

کرداروں کی علامتی نوعیت کو سمجھنا قارئین کو کہانی کے باہر سے ہٹ کر اور واقعات سے آگے دیکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ عمدہ کردار نگاری سے رائٹر اپنا پیغام غیر محسوس انداز میں قاری تک پہنچا دیتا ہے۔۔

اردو ادب میں علامتی کردار کا استعمال

ےےےےےےےےےےےےےےےےےےےے اردو ادب میں ایسے علامتی کردار، بھرپور تشبیہات، کلاسیکی شاعری اور جدید حقیقت پسندی کے امتزاج سے تخلیق کئے گئے ہیں جو علامتی مفہوم کو مجسم کرتے ہیں۔ اردو نثر، افسانے اور شاعری کے مختلف ادوار میں کردار کی علامت کس طرح کام کرتی رہی ہیں یہ جاننے کے لئے کچھ مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

1۔ کلاسیکی تمثیل اور داستانیں : ابتدائی اردو ادب کا بہت زیادہ انحصار تمثیل پر تھا، جہاں کردار براہ راست انسانی خوبیوں، برائیوں یا روحانی کیفیتوں کو ظاہر کرتے تھے۔ اس کی سب عمدہ مثال 1636 میں لکھا گیا ملا وجہی کا ناول " سب رس "ہے۔۔اردو کی پہلی نثری شاہکار سمجھی جانے والی یہ کتاب عشق حقیقی اور عشق مجازی کی تمثیل ہے۔ کرداروں کو لفظی طور پر انسانی خصلتوں کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ مرکزی کردار عاقل جسم پر حکمرانی کرتا ہے جب کہ دل حکمرانی کہیں اور ہوتی ہے۔
پلاٹ انسانی شخصیت کے اندرونی تصادم جو عقل اور جذبہ کے درمیان ہوتی ہے اسے ظاہر کرتا ہے۔
اس کی دوسری مثال میر امن کی باغ و بہار داستان ہے جس میں چار درویش روحانی سفر میں ہیں جو انسانی روح کے مختلف مراحل کی علامت ہیں۔ ان کے انفرادی نقصانات اور ان کا اختتام انسان کے صبر، جدوجہد اور تقدیر کے سامنے مکمل ہتھیار ڈالنے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

2۔ جدید مختصر کہانیاں یا افسانہ : بیسویں صدی کے مختصر افسانوں میں انتہائی پیچیدہ، نفسیات اور زندہ علامتی کرداروں کا استعمال کیا گیا ہے۔
اس کی ایک اہم مثال سعادت حسن منٹو کی کہانی ٹوبہ ٹیک سنگھ کا مرکزی کردار، بشن سنگھ کو تقسیم ہند کے دوران ایک ذہنی امراض کے کلینک کا باسی ہے، تقسیم کے اجتماعی صدمے، بے گھر ہونے اور پاگل پن کی ایک شاندار علامت ہے۔ بشن سنگھ ہندوستانی یا پاکستانی سرزمین پر کھڑے ہونے سے انکار کرتے ہوئے نو مین لینڈ میں مرنے کا انتخاب کرتا ہے جو وطن کے چھوٹنے اور اور شناخت کے بحران کا ظاہر کرتا ہے۔
اسی طرح انتظار حسین کی مختصر کہانیاں علامتوں کے استعمال کے لیے مشہور ہیں۔ انتظار حسین کی کئی کہانیوں میں ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو آدھے جانور ہیں یا جانوروں میں تبدیل ہو رہے ہیں (جیسے بندر یا کتے)۔ یہ کردار تقسیم کے بعد کے معاشرے کی اخلاقی زوال اور انسانی ضمیر کے کھو جانے کی علامت ہیں۔

3۔ جدید ناولوں میں قدیم کردار : جدید اردو ناول میں حقیقت پسندانہ کرداروں ملتے ہیں جو بڑے پیمانے پر سماجی، تاریخی یا فلسفیانہ وزن رکھتے ہیں۔

مثلاً قرۃ العین حیدر کی آگ کا دریا میں جو ایک تاریخی ناول ہے، بار بار آنے والے کردار نظر آتے ہیں یہ ہیں گوتم، ہری شنکر، چمپا، اور کمل — جو برصغیر پاک و ہند کی 2,500 سال کی تاریخ میں دوبارہ نمودار ہوتے ہیں۔ وہ مرتے نہیں بلکہ، وہ مختلف ادوار (بدھ مت دور، مغل دور، برطانوی راج، اور تقسیم کے بعد) میں دوبارہ جنم لیتے ہیں۔ وہ مشترکہ ثقافتی روح، بدلتی ہوئی شناختوں اور خطے کے ٹوٹے ہوئے ورثے کی اعلامت کے طور پر کام کرتے ہیں۔

اگلی مثال مرزا ہادی رسوا کا مشہور ناول امراؤ جان ادا ہے۔ امراؤ جان صرف ایک فرد، شاعر یا طوائف نہیں ہے۔ وہ 19 ویں صدی کے لکھنؤ کی زوال پذیر اشرافیہ کی ثقافت کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کی جدوجہد اعلیٰ فن اور سماجی استحصال کے درمیان المناک تصادم کی علامت ہے۔

4۔ اردو شاعری میں موجود مستقل کردار : اردو شاعری میں کچھ اصطلات نسلوں سے استعمال ہو رہی ہیں اور وہ کچھ خاص کرداروں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جیسے عاشق ایک بے لوث اور بے چین شخصیت کی نمائندگی کرتا ہے اور معاشرتی اصولوں کے خلاف بغاوت کی علامت ہے۔ جبکہ اردو شاعری کا رقیب مادی رکاوٹوں، سماجی دباؤ، اور حسد کی علامت ہے جو ایک شخص اور اس کے حاصل کے درمیان کھڑی ہیں۔ شیخ یا زاہد کو غالب اور اقبال جیسے کلاسیکی شاعروں نے بھی مذہبی منافقت، انتہا پسندی، اور روحانی گہرائی کی کمی کی علامت کے لیے استعمال کیا ہے۔

5۔ آفاقی یا سماجی نظریات کی نمائندگی (Representation of Ideas): علامتی کردار اکثر مخصوص عقائد یا نظریات کے ترجمان ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، اردو ناول "راجہ گدھ "میں" سیما "کا کردار محض ایک لڑکی کا نہیں، بلکہ اس کا کردار حرام خوری اور اخلاقی زوال کی علامت بن جاتا ہے ۔ اسی طرح" ابن الوقت "کا کردار برصغیر میں مغربی تہذیب کی اندھی تقلید اور منافقت کی علامت ہے۔

علامتی کرداروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ لکیر کے فقیر نہیں ہوتے۔ قاری ان کرداروں کو اپنی فکری صلاحیت کے مطابق الگ الگ معنی پہنا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ علامتی ادب (Symbolic Literature) وقت گزرنے کے ساتھ اپنی معنویت نہیں کھوتا۔

یہ کہ سکتے ہیں کہ علامتی کردار ادب میں محض کہانیاں آگے بڑھانے کا ذریعہ نہیں ہوتے، بلکہ یہ مصنف کے فلسفے، انسانی نفسیات اور معاشرتی حقائق کے ترجمان ہوتے ہیں

ابن صفی کے ناولوں میں علامتی کردار

سری ادب کی مقبولیت اور دیرپا ہونے کے لئے سب سے اہم اس کے مرکزی جزو ہیں۔ شرلاک ہومز، ہرکیو پولو سے فیلو دا اور بوم کیش بخشی تک جاسوس کا مرکزی کردار ہی ان ناولوں کی کامیابی کا ضامن رہا۔ لیکن ابن صفی نے ایک نہیں بلکہ دو شاندار مرکزی کردار عمران اور فریدی لکھ کر سری ادب کی تاریخ میں اپنا نام امر کر دیا لیکن ان کی کردار نگاری کی بلندی یہ تھی کہ انہوں کے ثانوی یا ایک بار نظر آنے والے کردار بھی بہت جاندار اور حقیقت سے قریب لکھے۔ ان کرداروں کو پڑھ کر انسان انہیں اپنے آس پاس محسوس کرتا ہے۔ یہ کردار صرف کہانی کو آگے بڑھانے کا ذریعہ نہیں ہوتے بلکہ یہ کبھی کسی طبقہ اور ملک کی علامت ہوتے ہیں تو کبھی کسی مخصوص طرز فکر کی نمائندگی کرتے ہیں تو کبھی معاشرے کی برائیوں پر طنز اور کبھی ایک مصنف کی خوش آئند سوچ کی علامت۔ غرضیکہ کرداروں کی ایک قطار نظر آتی ہے جنہیں ہم ان کی کہانیوں سے ہٹ کر بھی یاد رکھتے ہیں۔

ابن صفی کے کرداروں کو علامتی کرداروں کی صنف کی مناسبت سے دیکھیں تو ان میں روایتی کردار بھی بہت ہیں ہیرو، مینٹر، ولن جو فکشن کے مروجہ معیار پر پورے اترتے تھے۔ علامتی کردار کی پہلی قسم روایتی اور آفاقی کردار ہیں جو ہر فکشن میں ہوتے ہیں۔ مثلا فریدی ایک روایتی ہیرو کا کردار تھا بہادر، اصول پرست، نیک، خوش شکل۔ ایسے آئیڈیل کردار فکشن میں عام ہوتے ہیں۔

دوسری مثال سر سلطان کا کردار ہے جو گینڈالف جیسے مینٹر والے سانچے پر فٹ ہوتے ہیں۔

اسی طرح روایتی منفی کردار جیسے لیونارڈ، جیرالڈ شاستری، ڈاکٹر نجیب جو حالات یا مجبوری کے تحت برائی کی طرف نہیں آتے بلکہ مجرمانہ فطرت اور لالچ کے باعث غلط کام کرتے ہیں۔

علامتی کردار میں دوسری قسم تشبیہاتی کردار یا Allegory کی ہوتی ہے۔ ابن صفی نے جاسوسی میں خالص ایلوگری نہیں لکھی لیکن ان کا مرکزی کردار علی عمران کسی حد ایلوگری کردار کہا جاسکتا ہے وہ معاشرے کے دوہرے چہرے کی علامت ہے جو ظاہری طور پر حماقت کا ماسک پہنے اول جلول حلیہ میں دنیا کے سامنے آتا ہے ساتھ ہی وہ یہ بھی ثابت کرتا کہ ذہانت اور عقل کو صرف ظاہر سے جج نہیں کرسکتے اس کے علاوہ ان کے ناولوں میں زیرولینڈ اور طاقت جیسی تنظیمیں دنیا کی سیاست اور اس کے داؤ پیچ کی ایلوگری ہی ہیں جہاں اندھی عقیدت مفادات جھوٹ سب کچھ موجود ہے۔

تیسری قسم ایسے کرداروں کی ہے جو کسی خاص تہذیب قوم یا کسی سیاسی حالت کی علامت ہوتے ہیں۔ جیسے جوزف۔ وفادار غلامانہ ذہنیت کی علامت ہے۔ صدیوں سے انسان انسان کا غلام رہا ہے۔ اور وہ اپنی غلامی پر دل و جان سے خوش بھی تھا۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد اپنے مالک کی خوشنودی ہوا کرتی تھی۔ اس کیٹگری میں دیکھیں تو جوزف کا کردار ہزاروں سال کی غلامانہ ذہنیت پر جوزف ایک طنز بھی ہے اور اس کی علامت بھی۔ انسان صدیوں سے جس نظام کا حصہ رہا اسے غلام بنانا اور غلام بننا ایک عام رویہ لگتا ہے ۔ ہماری روزمرہ زندگی میں بھی ہم کہیں نہ کہیں جوزف کی وفادار اور غلامانہ ذہنیت میں اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ آج بھی اس خطے میں ایسے غلام موجود ہیں جو بس اب غلام کہلاتے نہیں ہیں لیکن ان کا درجہ غلام سے بڑھ کر بھی نہیں ہے۔

سلیمان کی بات کریں تو وہ رحمان صاحب کا پشتینی ملازم ہے۔ خاندانوں میں نسل در نسل ملازمین ہوا کرتے تھے یہ غلامی کی جدید شکل ہے پہلے غلام ہوا کرتے تھے اس کے بعد ملازمین کے نام سے جانے جانے لگے۔ دادا سے پوتے تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ سلیمان اس روایت کی روشن مثال ہے۔

آصف فیاض: کرپٹ سرکاری ملازم کی مثال کہہ سکتے ہیں اس خطے میں ہر ایک سرکاری و غیر سرکاری محکموں میں کرسی پر قابض طاقت ور افراد ہوتے ہیں۔ جو اپنی طاقت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ افسران کے سامنے بھیگی بلی جیسے ہوتے ہیں۔ اور اپنے سے نیچے والوں کے لیے عذاب۔

تنویر: آوارہ منش نوجوان جو کسی منصب پر بھی ہوں تو ان کے کرتوت نہیں بدلتے۔ وہ اپنی غلط فطرت پر قائم رہتے ہیں ان کو لگتا ہے کہ وہ آوارگی کا لائسنس رکھتے ہیں۔

حمید: جنگ سے بیزار نوجوانوں کی سب سے روشن مثال ہے۔ جنگ عظیم کے دھاکوں نے جس طرح انسانیت کے مجموعی پر کاری ضرب لگائی۔ اپنی آنکھوں میں خواب سجائے ہزاروں نوجوانوں جنگ کے شعلوں کی نظر ہو گئے۔ جو میدان جنگ کی ہولناکیوں اور سفاکیوں سے زندہ لوٹے۔ ان کی روح مردہ ہو چکی تھی۔ وہ آگ اور خون کر اس سمندر کو عبور کر کے واپس پہنچے تھے کہ ان سے زندگی کے تمام خواب کھو گئے تھے۔

کیپٹن حمید اسی دور کے نوجوانوں کی عکاسی کرتا کردار ہے۔

ظفر اور جیمسن: ساٹھ ستر کی دہائی کے سب سے بڑے مسئلہ ہپی ازم کی مثال ہیں۔ 60 اور 70 کی دہائی میں نشے کو فینٹیسائز کیا گیا اس کے حوالے سے ایسا ماحول پیدا کیا گیا ہے نئی نسل نشہ کرنا گناہ یا بری لت نہ سمجھے بلکہ اس کو دنیا اور انسانیت سے جڑے کسی عظیم مقصد کے حصول کی کوشش سمجھے۔

جیمسن اور ظفر الملک اسی دور کے نمائندہ کردار ہیں جو ہپی ازم کو اپناتے ہیں۔

ساواکا: غلط راہ پر چلنے والے جاپانی نوجوان کا کردار ہے۔ جنگوں میں شکست وریخت کے اقوام کئی قصوں میں بٹ جاتی ہیں۔ ان میں کچھ ملک کو ترقی کی راہ پر لیجانے کا عزم کرتے ہیں اور کچھ اپنی شکست اور ذلت بدلہ لینے کے لیے، ظالموں کے خلاف ان سے بڑے ظالم بن جاتے ہیں۔ ساواکا اسی جہت سے تعلق رکھتا ہے۔

چوتھی قسم متضاد کردار ہیں ایسے کردار ابن صفی کے ناولوں میں بہت مل جاتے ہیں جہاں سچ اور جھوٹ نیکی اور بدی۔۔ عقل مندی اور حماقت، اصول پسندی اور بے اصولی کے تضاد کو کرداروں کے ذریعہ بیان کیا گیا۔ سب سے بڑی مثال فریدی اور عمران کی ہے۔ فریدی اصول پسند، سنجیدہ مزاج اور رکھ رکھاؤ والا کردار ہے اس کے بر خلاف عمران کا کردار کھلنڈرے، ہر طریقہ سے کام چلانے والے نوجوان کا ہے۔۔ جو اکثر ایسا حلیہ بنائے رکھتا جو اسے احمق ثابت کرے۔ ان کے علاوہ منفی کرداروں میں سنگ اور تھریسا اس تضاد کی مثال ہیں۔

سنگ ہی کا نام سنتے ہیں ذہن میں کمینگی، خباثت، شیطانیت اور ہوس جیسے الفاظ پورے آب وتاب سے نظر آتے ہیں۔ یہ سراپا برائی ہے اس کا مقصد صرف اپنی انا کی تسکین ہے ۔ اسی طرح نیکی بدی اچھائی برائی کے نظریات کو بھی کرداروں کے ذریعہ اجاگر کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے اندر مکمل ہوتے ہیں وہ اچھے یا مثبت ہیں تو مکمل طور پر اسی پر کاربند ہیں وہ برائی کو منبع ہیں تو برائی ان کا مقصد ہے۔

عمران اور سنگ ہی اس کی ایک مثال کہے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح صف شکن اور شہباز کو ہی کو دیکھا جائے تو وہ بھی اس کی مثال ہیں۔

ایک جانب صف شکن ٹھنڈے مزاج کا، بنا کسی انانیت کے اور حکمت عملی سے کام لینے والا دور کی سوچنے والا، ندھی عقیدت سے دور ہے اور دوسری طرف شہبار کو ہی غصہ ور، اندھی عقیدت میں مبتلا اپنی انا کی وجہ سے چوٹ کھاتا بنا کی سوچے سمجھے لڑمرنے والا کردار ہے۔ ایسے کئی اور کردار بھی ابن صفی کے ہاں ہمیں ملتے ہیں۔

علامتی کرداروں میں پانچویں قسم ایسے کرداروں کی جو اپنے ظاہری حلیہ یا نام سے ہی کافی کچھ ظاہر کر دیتے۔ ٹھنڈا سورج میں پانچ بڑی طاقتوں کے نمائندہ کا سارا سیاسی پس منظر صرف نام سے ظاہر ہو جاتا ہے اسی طرح چار مجرموں کو چار بڑے فلسفوں کے نام سے منسوب کر کے ان کی ذہنیت ظاہر کی گئی۔

ظاہری شخصیت کے لحاظ سے قاسم، فنچ، ہمبگ، مردنگ، کرنل ایڈوین جیسے کئی کردار ملتے ہیں جو اپنی جسمانی ہئیت کی وجہ سے ایک مخصوص طبقہ کے نمائندہ بن جاتے ہیں۔

ابن صفی کے ایسے علامتی کردار جابجاہیں۔ کچھ اور مثالوں کی بات کریں تو اپاہج بن کر تبلیغ کرنے والا داور، رائی کے پربت کا تیاگی اور صحرائی دیوانہ کا موجی بابا یہ سارے کردار مظلومیت اور مذہب کا سہارا لے کر نوجوانوں کو بہکاتے ہیں۔

علامتی کردار ناول نگاری اور افسانہ نگاری میں استعمال والی ایک ایسی تکنیک ہے جس کا استعمال دنیا بھر کے تمام ادب میں موجود ہے اسی طرح اردو ادب میں بھی مختلف مصنفین کے ہاں ہمیں کہیں نہ کہیں یہ تکنیک دیکھنے کو ملتی ہے لیکن اگر ہم اس تکنیک کو مکمل اور پورے انداز میں استعمال ہوتا ہوا دیکھنا چاہیں تو یہ ہمیں جاسوسی ناول نگاری کے جد امجد بانی اور سب سے بڑے نام ابن صفی کے ناولوں میں جابجا نظر آتی ہے۔

ابن صفی نے جہاں اپنے ناولوں میں زبان وبیان کا خیال رکھا، کردار نگاری پر زور دیا، جہاں انہوں نے زبان کے کہ اعلی ترین معیار کو برقرار رکھا۔ جہاں انہوں نے منظر کشی اور کہانی میں نئی روایت قائم کی۔۔ جس طرح انہوں جاسوسی ناول نگاری کو بازاری اور لچرپن سے نکال کر عظیم ادب کا درجہ دیا اسی طرح انہوں نے اس تکنیک کا بھی بھرپور استعمال کیا ان کے علاوہ کسی اور جاسوسی ناول نگار کے ہاں یہ تکنیک باقاعدہ طور پر تلاش کرنا بہت مشکل کام ہے جبکہ ابن صفی کے ناولوں میں علامتی کردار نگاری جابجا نظر آتی ہے۔ عمران سیریز اور جاسوسی دنیا میں ابن صفی نے جتنے کردار تراشے جتنی دنیائیں تخلیق کی، جتنی کہانیاں لکھی جتنے مناظر قلم کے ذریعے قارئین تک پہنچائے ان سب میں ابن صفی نے جو کمال کیا ہے وہ بے مثال ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے علامتی کردار نگاری میں عمران فریدی سے لے کر تنویر صفدر جولیا قاسم، کیپٹین حمید انسپکٹر آصف، سر رحمان سر سلطان اور اسی طرح مجرموں میں سنگ ہی، تھریسیا، نانوتہ اور ایڈلاوا سمیت اپنے ہزاروں سینکڑوں منفی مثبت ضمنی مرکزی کرداروں میں اس تکنیک کو بھرپور استعمال کیا ہے۔۔

اسی باعث ابن صفی کا کام ایسا نہیں ہے کہ قاری ان کو ایک بار پڑھ کر ان سے مکمل استفادہ حاصل کر سکے۔ ہو سکتا ہے پہلی بار پڑھنے والا ان کی زبان کا لطف لے۔۔ دوسری بار پڑھنے والا ان کے کرداروں کو سمجھے، تیسری بار پڑھنے والا ان کے مزاح کو سمجھ سکے اور ان کے کہانی کی تکنیک اور گہرائی کو سمجھ پائے ۔ اسی طرح ان کے کام ان کے قلم کی تصوراتی دنیا میں کھو جانے والے قارئین یہ سمجھ پاتے ہیں کہ ابن صفی کے ہاں فلسفہ بھی ہے منطق بھی ہے ان کے ہاں کہانی کے وہ تمام اسرار رموز موجود ہیں جو دنیا میں کسی بھی ادب کو بڑا بنانے کے لیے موجود ہونا چاہیے اور ہر وہ تکنیک بھی جو ان کی تخلیق کو ان کے کرداروں کو دوام بخشتی ہے۔

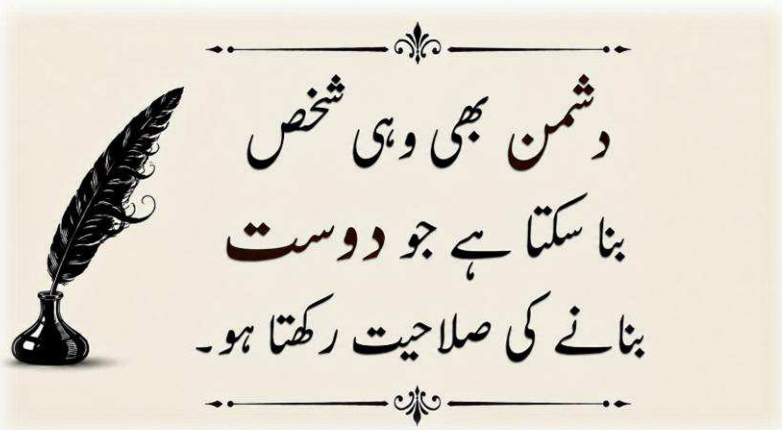

اسرار ناروی

شہر دیوانگی

ہے حکم ترا مٹ جائیں ہم لیکن نہ کسی کو گواہ کریں
جو دل چاہے ہم کرتے رہیں لیکن نہ خودی کی چاہ کریں
جیتے جی مر جائیں بھلے لیکن نہ زباں سے آہ کریں
دیوانگیوں کے شہر بتا ہم کیوں تیری پرواہ کریں

تو روشنیوں کا شہر بھی ہے لیکن یہ بتا ہے کس کے لئے
کیا اس کے لئے جس نے تجھ کو چمکایا ہے دمکایا ہے
اس بیچارے کی جھونپڑی میں ننھی سی کرن بھی تو نہ ملے
دیوانگیوں کے شہر بتا ہم کیوں تیری پرواہ کریں

ہر شخص یہاں فرعون نما، ہر فرد یہاں کا تیغ بکف
اٹھلاتی ضلالت پھرتی ہے ہر وقت ہماری چاروں طرف
بے دینی کا یہ عالم ہے اٹھتے ہیں ہر سو جھوٹے حلف
دیوانگیوں کے شہر بتا ہم کیوں تیری پرواہ کریں

یہ صاحب کے نیچے والے افسر کا بابو بیٹھا ہے
گر بات کرو تو پتا چلے بالکل بے قابو بیٹھا ہے
دولتیاں جھاڑے گا اٹھ کر کرسی پر یا بو بیٹھا ہے
دیوانگیوں کے شہر بتا ہم کیوں تیری پرواہ کریں

****

غزل

اے نگارانِ خوبرو آؤ
ہو کے دیکھو تو دوبدو آؤ

یوں نہ دیکھو کہ راہ رو ہو گا
تھی تمھاری ہی جستجو آؤ

کیا سمجھتے ہو جام خالی ہے
پھر چھلکنے لگے سبو آؤ

رات ڈھلنے پہ آئے بھی تو کیا
گرم ہے وقت کا لہو آؤ

****

غزل

قفس کی داستاں ہے اور ہم ہیں
اشاروں کی زباں ہے اور ہم ہیں

پئے مرہم ضروری ہے جراحت
صفِ نشتر زناں ہے اور ہم ہیں

کرم ہے یہ بھی میر کارواں کا
غبار کارواں ہے اور ہم ہیں

بچا ہی کیا ہے جو رہزن لوٹ لیں گے
متاعِ نقد جاں ہے اور ہم ہیں

شمارِ زخم ہائے دل کہاں تک
حساب دوستاں ہے اور ہم ہیں

کہانی ختم ہوتی ہے نہ شب ہی
وہی معجز بیاں ہے اور ہم ہیں

****

غــزل

آج کی رات کٹے گی کیونکر ساز نہ جام نہ تو مہمان

صبح تلک کی-ا جانیے کیا ہ-و آنکھ لگے ی-ا جائے ج-ان

پچھلی رات کا سناٹا کہتا ہ-ے اَب کیا آئیں گ-ے

عقل یہ کہتی ہے سو جاؤ دل کہتا ہے ایک نہ مان

ملک ط-رِب ک-ے رہنے وال-و ی-ہ ک-یسی م-جبوری ہ-ے

ہونٹوں کی بستی میں چراغاں دل کے نگر اتنے سنسان

اُن کی بانہوں کے حلقے میں عشق بنا ہے پیر طریق

اب ایسے میں بتاؤ یارو کس جا کفر کدھر ایمان

****

غزل

کبھی قاتل، کبھی جینے کا چلن ہوتی ہے
ہائے کیا چیز یہ سینے کی جلن ہوتی ہے

چھیڑیے قصۂ اغیار ہی، ہم سن لیں گے
کچھ تو کہیۓ کہ خموشی سے گھٹن ہوتی ہے

یادِ ماضی ہے کہ نیزے کی اَنّی کیا کہیۓ؟
ذہن میں ایسی چبھن، ایسی چبھن ہوتی ہے

پھول کھلتے ہی چمن آنکھ سے اوجھل ہو کر
ڈھونڈتا ہے اسے جو رشکِ چمن ہوتی ہے

کتنی ہی زہر میں ڈوبی ہوئی رکھتی ہو زباں
ں پھر بھی وہ نازشِ گل غنچہ دہن ہوتی ہے

جو کہہ گئے وہی ٹھہرا ہمارا فن اسرار
جو کہہ نہ پائے، نہ جانے وہ چیز کیا ہوتی

****

غزل

مدتوں ذہن میں گونجوں گا سوالوں کی طرح
تجھ کو یاد آؤنگا گذرے ہوئے سالوں کی طرح

ڈوب جائے گا کسی روز یہ خورشید انا
مجھ کو دہراؤ گے محفل میں مثالوں کی طرح

یاد رہتے ہیں وہی لوگ مثالوں کی طرح
زندگی جن کی گذرتی ہے اجالوں کی طرح

چلتے ہو تو
راستے بول
اٹھتے ہیں

سفرِ حیدرآباد

رخسانہ نازنین

حیدرآباد۔۔۔۔۔۔ شہر نگاراں۔۔۔۔۔ جس کی بنیاد ہی۔ محبت کی اینٹوں سے رکھی گئی۔ جس کے خمیر میں محبت اور وفا رچی بسی ہے۔ قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے عشق کی داستاں جس کے باعث یہ شہر آباد ہوا۔ یہ تاریخ کا وہ سنہرا باب ہے اور ایک انوکھی محبت بھری کہانی جو حقیقت کا روپ لے کر حیدرآباد شہر کے سانچے میں ڈھل گئی۔ قلی قطب شاہ نے اپنی محبوب بیگم حیدر محل کے نام کی نسبت سے اسے حیدرآباد کے نام سے موسوم کیا۔ اور دعا کی کہ

میرے شہر کو لوگاں سے معمور کر

آج اس دعا کی قبولیت کا احساس اسلئے قوی ہے کہ حیدرآباد کی آبادی دن بدن اپنے سابقہ ریکارڈ توڑتی بڑھتی جارہی ہے۔ اس شہر نے ملک بھر کے باشندوں کو بنا کسی مذہب وملت کی تفریق کے اپنے دامن میں پناہ دے رکھی ہے۔ اور وہ امن وچین سے خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔۔۔۔

سفر حیدرآباد ہمیشہ سے میرے لئے ایک خوشگوار تجربہ رہا۔ بچپن کی یادوں میں اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔ جب بھی ابا اور امی حیدرآباد جانے کا ارادہ کرتے میں خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ ابا امی شاپنگ کی لسٹ بناتے جس میں میں اپنی فرمائشیں درج کرواتی۔ جس میں لاڑ بازار سے نگوں کا جوڑا اور چوڑیاں ضرور شامل ہوتیں۔ اور مکسچر کھارا اور قلاقند۔۔ ۔۔۔ پیکنگ ہوتی۔ اس دور میں مہمان اپنے ساتھ اپنی ضرورت کی تمام اشیاء لے جاتے تھے۔ لہذا بستر بند اسٹور روم سے نکالا جاتا اور ضروری چادریں تکئے شال وغیرہ رکھ لئے جاتے۔ بیگ میں فاروقی منجن۔ صابن تولیہ۔ کنگھیاں۔ دوائیں۔۔۔ سوٹ کیس میں کپڑے۔ توشے دان اور پانی کے باٹل کی الگ تھیلی۔۔۔ توشے میں قیمہ آلو میتھی کی بھاجی اور خستہ پراٹھے۔۔۔ امی کے ہاتھوں کا وہ ذائقہ جو کبھی بھول نہیں سکتی۔۔۔ ٹرین یا بس میں سفر ہوا کرتا۔ ٹرین کے سفر کا مزہ تو پوچھئے مت۔ تیزی سے بھاگتے دوڑتے مناظر۔۔۔ مونگ پھلی۔ جام۔ بیر۔ بھنے ہوئے چنے بٹانے۔ کھاری مری بیچنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ اسٹیشن پہ ریل گاڑی چھک چھک کرتی دھواں خارج کرتی آکر رکتی تو میرا دل دھک دھک کرتا۔ سہم سی جاتی کہ اتنے سارے لوگوں کو جگہ کیسے ملے گی۔۔۔۔۔؟ اف۔ وہ معصومیت۔۔۔ اکثر ٹرین لیٹ ہوتی تو ویٹنگ روم میں بیٹھ کر انتظار کیا جاتا۔ اور ویٹنگ روم مجھے بہت اچھے لگتے۔ صاف ستھرے سیلنگ فیان اور لکڑی کے صوفوں سے آراستہ۔۔۔ ان دنوں ہم جیسے متوسط طبقے کے گھروں میں زیادہ سیلنگ فیان اور عمدہ صوفے نہیں ہوا کرتے تھے۔ سفر کے دوران کئی اجنبی لوگوں سے دوستی ہو جاتی۔ پھر توشے دان سے لوازمات بھی شیئر ہوتے۔ میں ہر اسٹیشن کا نام پوچھا کرتی۔ ابا بتاتے جاتے۔ ظہیر آباد کوہیر وقارآباد۔۔۔۔۔۔۔ خیرت آباد آتا تو چلو اب حیدرآباد آجائے گا۔ دوپہر کو بیدر سے نکلی ٹرین رات 8 یا 9 بجے حیدرآباد پہونچتی۔۔ مغرب کے بعد میں کھڑکی سے ہٹ جاتی۔ اندھیرے سے خوف محسوس ہوتا۔ پھر تاریکی میں دور سے جھلملاتی روشنیاں دکھائی دینے لگتیں تو میں خوش ہو کر کہتی۔ آگیا حیدرآباد۔۔ ابا امی مسکرانے لگتے۔ نامپلی اسٹیشن تو میرے لئے گویا ایک نئی دنیا تھا۔ سجے سجائے شوروم۔۔ پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پہ جانے کی سیڑھیاں۔ لاؤڈ سپیکر میں ٹرینوں کے اوقات بتائے جانے کی آوازیں۔ قلیوں کی بھاگ دوڑ۔ یہاں وزن کروانے کی مشینیں نصب ہوتیں جن پہ وزن کروانے کے بعد ایک ٹکٹ نکلتا جس پہ کچھ نہ

کچھ لکھا ہوتا۔ جو جاننے کے شوق میں ضد کر کے میں ہر بار وزن کرواتی اور ساری ٹکٹیں جمع کرتی۔ عجیب عجیب شوق تھے۔۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی رکشا ران اور آٹو ڈرائیور منتظر ہوتے۔ بیدر میں آٹو نہ تھے اسی لئے میں آٹو لینے کو کہتی۔ اور میری فرمائش ٹالنا تو ابا کو کبھی منظور نہ تھا۔ خالہ جان کوٹلہ عالیجاہ میں مقیم تھیں۔ ناملی سے کوٹلہ عالیجاہ کا فاصلہ کچھ طویل ہی ہے۔ راستے بھر میں سڑک کی دونوں جانب بڑی بڑی دکانیں اونچے اونچے سائن بورڈس۔ نئی فلموں کے اشتہارات دیکھتی۔ چوراہوں پہ ٹریفک کا رکنا۔ ٹریفک پولیس کا سیٹی بجاتے ہی سب سواریوں کا دوڑنا۔ ڈبل بسیں۔۔۔۔ کہیں اکا دکا تانگہ کبھی کبھی دکھائی دیتا۔ نیا پل۔ مدینہ بلڈنگ۔ پتھر گٹی۔ گلزار حوض۔ چارمینار سے ہو کر کوٹلے کی سڑک پہ آٹو آتا۔ کوٹلہ عالیجاہ کے دروازے سے گزر کر ہم اندھیری گلی میں پہونچتے۔ جہاں خالہ جان کا گھر تھا۔ دستک پہ دروازہ کھلتا اور مہمانوں کی آمد پہ سب خوشی سے کھل اٹھتے۔ میری خالہ زاد بہنوں سے بہت دوستی تھی۔ وہ مجھ سے عمر میں بڑی تھیں۔ میں انکی تقلید کیا کرتی۔ خالہ جان کا گھر دو منزلہ تھا۔ ہمیں اکثر بالائی منزل پہ ٹھرایا جاتا۔ چاندنی پہ کھلی ہوا اور آسمان میں چمکتے چاند تارے دیکھنے کا مزہ ہی اور تھا۔ حیدرآباد کے حدود میں داخل ہوتے ہی مجھے ایک عجیب سی خوشبو آتی۔ شاید گمان ہو لیکن واقعی خوشبو محسوس ہوتی جسے میں دل ہی دل میں حیدرآباد کی خوشبو کا نام دیتی۔ اور مسرور ہوتی۔

قصہ مختصر کہ حیدرآباد کے سفر پہ جب بھی نکلتی ہوں۔ یادوں کا ایک ہجوم ہمسفر ہوتا ہے۔ بچپن سے آج تک حیدرآباد کا سفر زندگی کے سنگ سنگ چلتا رہا۔۔۔۔۔ پہلے علاج کی غرض سے سالہا سال قیام رہا۔۔۔۔۔ پھر اس شہر نے ہمیشہ کے لئے مجھے اپنالیا۔۔۔۔۔ جیون کی ڈور بندھ گئی اس شہر کے باسی سے۔۔۔۔۔ سسرال۔۔۔ وطن ثانی۔ سو آج بھی آئے دن آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اس شہر کے لوگوں سے ہمیشہ مجھے خلوص ملا۔ احترام عزت اور توقیر ملی۔ ہر رشتے کے حوالے سے۔۔۔ ہر دور میں۔ ۔۔۔۔ اسی خلوص کی بدولت میں حیدرآباد کے سفر و حضر میں فخریہ احساس سے دوچار ہوتی ہوں۔

آج بھی سفر حیدرآباد میرے لئے پر لطف اور خوشگوار تجربہ ہوتا ہے۔ ایک کسک ضرور ہوتی ہے گھر سے نکلتے ہوئے کہ اب وہ دو ہستیاں نہیں جو نہایت آرزو ارمان سے مجھے حیدرآباد کے سفر پہ وداع کرتے تھے اور صرف چند دنوں کی جدائی پہ آبدیدہ ہوا کرتے تھے۔ اللہ حافظ ابا۔۔۔ اللہ حافظ امی۔۔۔۔۔۔ اب بھی بے ساختہ لبوں پہ یہ لفظ مچل اٹھتے ہیں لیکن پلٹ کر دیکھتی ہوں تو دل سے ہوک اٹھتی ہے۔ سونے دروازے پر ڈالا جاتا قفل یاد دلاتا ہے کہ وہ دونوں تو اپنے آخری سفر پہ روانہ ہو چکے۔ اب نہ کوئی وداع کرنے والا ہے نہ انتظار کرنے والا۔ !

زندگی اپنی ڈگر پہ چل پڑی ہے۔۔ کار جیسے ہی اسٹارٹ ہوتی ہے صاحب زادے دعائے سفر باآواز بلند پڑھتے ہیں اور سفر شروع ہو جاتا ہے مختصر سا اسباب لئے کار کی پچھلی نشست سے سر ٹکائے میں گزرتے مناظر میں کھو جاتی ہوں۔ لیکن جنید کی باتیں مجھے خیالوں کی دنیا سے واپس کھینچ لاتی ہیں۔ اور انہیں (جنید کے پاپا) اوور ٹیک کرنے سے باز رہنے کے لئے کہتی ہوں اور ساتھ ہی رفتار دھیمی رکھنے کی گزارش بھی ہوتی رہتی ہے

کبھی دھیما کبھی تیز آواز میں بجتا میوزک سفر کے لطف کو دوبالا کر دیتا ہے۔ شاہ پور گیٹ پار کیا کہ تیلنگانہ کی سرحد میں داخل ہونے کا میسیج موبائیل میں آجاتا ہے۔ ! کتنی حیران کن ہے یہ ٹیکنالوجی ہماری ہر نقل و حرکت کی خبر ہو جاتی ہے۔ ! پھر مرزا پور کتور شوگر فیکٹری جس کے میلوں ایکٹر پھیلے احاطے میں موسم سرما میں گنے سے لدی لاریاں ٹریکٹر اور بیل گاڑیاں اپنی باری کی منتظر کھڑی رہتی ہیں۔ یہ منظر بھی ہر بار ایک پرانی یاد تازہ کرتا ہے۔ مجھے ابا نے یہ شوگر فیکٹری دکھائی تھی۔ گنے کو شوگر میں کیسے تبدیل کیا جاتا ہے اس پوری کاروائی کا مشاہدہ کروایا تھا۔ اللہ ابا کو غریق رحمت کرے۔ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

پھر ظہیر آباد جو کبھی ایک چھوٹا سا قصبہ ہوا کرتا تھا اب بے پناہ ترقی کر چکا ہے اور ایک شہر میں بدل گیا ہے۔ پھر سداسیو پیٹ۔ سنگاریڈی جانے والی شاہراہیں بھی اب ہر سائڈ ون وے ہو گئی ہیں جس کا حکومت ٹیکس وصول کر رہی ہے ! کتنی حیرت ہوتی ہے سرکار کی پالیسیوں پہ۔ !سڑک پہ آمد و رفت کا بھی ٹیکس ادا کرنا ہوتا ہے ! سرکار کا بس چلے تو عوام کی سانسوں پہ بھی ٹیکس عائد کر دے !پٹن چیرو سے قبل آتا ہے سفر کا ایک اہم پڑاؤ

"سوئیٹ ہارٹ ریسٹورینٹ"

جہاں کی فرحت بخش سرور انگیز کیف آور چائے میری کمزوری ہے۔ ہر سفر میں آتے جاتے یہاں رک کر اسنیکس لیتے ہیں اور چائے پی کر تازہ دم ہوتے ہمارا سفر پھر سے شروع ہوتا۔ آٹر رنگ روڈ جو راجیو گاندھی انٹر نیشنل ایئر پورٹ جانے کے لئے بنائی گئی ہے۔ اسی شاہراہ سے ہم حیدر آباد کے لئے روانہ ہوتے ہیں کیونکہ یہاں نسبتاً ٹریفک کم ہوتی ہے۔ اور کشادہ خوبصورت سڑک پہ برق رفتاری سے دوڑتی چمچماتی کاروں کی آمدورفت کا منظر بڑا سہانہ لگتا ہے۔ میرا بیٹا ہر کار کی قیمت بتاتا جاتا ہے۔ ممی۔ یہ دیکھو یہ 10 لاکھ کی کار ہے۔ ممی یہ 30 لاکھ کی کار ہے ان کاروں کی تیز رفتاری دیکھکر مجھے حیرت ہوتی ہے۔ اور سوچتی ہوں

ہمارا ملک غریب کہاں رہا اب۔ ! یہاں کے باشندے لاکھوں کڑوڑوں کی سواریوں میں سفر کرتے ہیں۔ ! لیکن یہ حقیقت بھی فوراً سامنے آجاتی ہے کہ اسی ملک میں سارا دن کی محنت کی اجرت چند سو روپئے ہوتی ہے جس سے مزدوروں کے چولہے جلتے ہیں۔ ! امیری غریبی کا یہ فرق ایک بار پھر مجھے مضطرب کر دیتا ہے۔

سڑک کے بیچوں بیچ بنے ہمہ اقسام کے پھلوں پھولوں کے پودے اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ بلند و بالا اپارٹمینٹس۔ پہاڑوں کو تراش کر تعمیر کئے گئے ہیں۔ غرض ہر سو جدیدیت کے آثار نمایاں ہیں۔ اور پھر ہم ٹول گیٹ پہ فیس ادا کر کے حیدر آباد میں داخل ہوتے ہیں۔ عجیب سی خوشی کا احساس رگ وپے میں سرایت کر جاتا ہے۔ خیر وعافیت سے منزل مقصود پر پہنچنے کا احساس ! پروردگار کا شکر ادا کرتی دل کی دھڑکنیں ! اور ساتھ ہی ایک اور آرزو ایک اور ارمان کہ

اے اللہ۔ ہماری زندگی کا سفر بھی یونہی سہل فرما۔ ہمارے آخری سفر کا زادراہ نیکیوں کی گٹھری ہو۔ جو ہمیں ہماری حقیقی منزل تک با آسانی پہنچادے۔ آمین ثم آمین

باقی سب افسانے ہیں!

رکا ہوا فیصلہ

شاہین کمال (کیلگری)

امی قیصر صاحب کون ہیں؟

چھوٹی کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا جس نے مجھے چونکا دیا۔

کیا؟ کون قیصر؟

میں اچھنبے میں تھی۔ بہت ذہن دوڑایا، یاداشت کو کھنگالا پر کوئی قیصر یاد آ کر نہ دیے۔ جب سے عمرِ بے کار کی ساٹھویں پائیدان پر قدم رکھا ہے، لگتا ہے جاتے وقت نے بھول و نسیاں سالگرہ کے تحفے کے طور پر تھمادیا ہے۔ جسمانی تغیر تو کم ہے پر ذہنی خلفشار بڑھ گیا ہے۔ باتیں اور چہرے بھولنے لگی ہوں۔ چیزیں رکھتی کہیں اور ڈھونڈھتی کہیں ہوں۔

بقول پروین شاکر

چہرہ و نام ایک ساتھ آج نہ یاد آ سکے ۔

ایک دم سے ذہن میں جھماکہ سا ہوا اور میں نے بے ساختہ کہا اچھا اچھا آروی تم قیصر ماموں کے متعلق پوچھ رہی ہو مگر وہ تمہیں کیسے یاد آ گئے؟

ہاں یہ قیصر ماموں امی کے فرسٹ کزن ہیں اور پٹنہ میں رہتے ہیں۔ اب تو بہت ضعیف ہو گئے ہوں گے، جانے زندہ بھی ہیں کہ نہیں مگر تم انہیں کیسے جانتی ہو؟

میرا نہیں خیال کہ میں نے کبھی تم سے ان کا ذکر کیا ہے۔ میں ابھی تک الجھی ہوئی تھی۔

نہیں بھئی آپ کے قیصر ماموں کو میں نہیں جانتی، میں تو ان قیصر کی بات کر رہی ہوں جنہیں آپ نے اپنے فیس بک پر غزل dedicate کی تھی۔

آروی کا لہجہ تلخ اور آواز روکھی تھی۔

میں نے غزل ڈیڈیکیٹ کی تھی کسی قیصر کو؟

مگر میری فرینڈ لسٹ میں تو کوئی مرد قیصر نام کا ہے ہی نہیں۔

میری حیرانگی بدستور قائم تھی۔

جی وہ پاکستانی سنگر ہیں نا، وہی آپ کی پسندیدہ نیرہ نور یا کون ان کی کوئی غزل تھی۔ آپ بہت سنتی ہیں اسے۔ ابھی مجھے اس کے بول یاد نہیں آ رہے۔

جانے کیوں چھوٹی کے لہجے کی تلخی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔

ایک دم سے دماغ کی بتی روشن ہوئی اور میں بے ساختہ ہنستی چلی گئی۔

او قیصر !!ہاں بھئی یہ میری پاکستانی دوست قیصر شوکت ہیں بلکہ میری شاگرد بھی ہیں۔ اس کا موسیقی کا ذوق بہت اچھا ہے اور ہم دونوں ہی نیرہ نور کے فین ہیں۔ یہ اسلام آباد میں رہتی ہے۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

کیا عجیب مردانہ قسم کا نام ہے؟

بندہ خواہ مخواہ ہی میں کنفیوژ ہو جائے۔

چھوٹی کا شکی لہجہ مجھے سلگا گیا۔

تو اگر قیصر مرد بھی ہوتی تو کیا ہوا، غزل کی ڈیڈیکیشن ایسا کون سا قابل گردن زدنی جرم ہے؟

میری آواز قدرے اونچی ہو گئی۔

کمال کرتی ہیں مما آپ! یہ بھی کوئی عمر ہے ان باتوں کی؟

میں اسے جواب دینے ہی والی ہی تھی کہ بے اختیار میری نظریں اس کی کن سوئیاں لیتی ساس پر پڑ گئی اور میں نے نوکِ زبان پر آئے جواب کو بمشکل پیچھے دھکیلتے ہوئے ہائی چیئر پر بیٹھے اپنے نواسے کو کیلا مسل کر کھلانے لگی۔

پر یہ بات میرے دل میں آنی کی طرح گڑ گئی۔

گھر واپس آنے کے بعد بھی طبیعت مکدر رہی، بلآخر شاور لے کر میں نے اپنے تپتے دماغ اور بلند فشارِ خون کو شانت کیا۔ میری چھوٹی بیٹی آروی کے علاوہ اگر کوئی غیر یہ بات کہتا تو میں سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہ کرتی مگر چھوٹی؟

چھوٹی ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہے؟

میری پوری زندگی آئینہ کے مانند ان دونوں بہنوں کے سامنے ہے۔

میری زندگی کیا تھی بس گویا دکھوں سے عبارت تھی۔ ہم لوگ یعنی امی، ابا، بھیا اور میں ڈھاکہ میں ایک شاندار زندگی جی رہے تھے۔ ابا جان کی پرانے ڈھاکے میں ماچس فیکٹری تھی اور ہم لوگوں کی رہائش دھان منڈی کے پر سکون علاقے میں تھی۔ وہ خوب صورت دھان منڈی جس کی گلیاں پرانے برگد کے باعث ٹھنڈی اور پر سکون تھیں اور جس کے تالاب کنارے سپاری اور ناریل کے بے شمار درخت تھے۔ وہی پر سکون خطۂ زمین جہاں دن بھر رنگ رنگ کے پرندے نغمہ سرا رہتے۔ وہ بہت سہانا وقت اور چین کی گھڑی تھی۔ پھر رُت بدلتی گئی اور محبت کے راگ بین اور سوگ میں ڈھل گئے۔ بیوروکریسی کی منافقت، جرنیلوں کی عیاشی و ہوس اور سیاست دانوں کی عیاری و اقتدار پرستی نے نفرت کی ایسی ہوّن جلائی جیسے لاکھوں جان کا بلیدان بھی نہ بجھا سکا۔

اقبال کا رخشندہ خواب محض چوبیس سال میں ڈراؤنا خوب بن گیا اور اس کی تعبیر میں لاکھوں غیر بنگالی محبان وطن پیوندِ خاک ہوئے۔ جو بچ بچا کر پاکستان نہیں نکل سکے، بنگلہ دیش میں ان کی زندگیاں جہنم سے بھی بدتر ہوئیں۔ ہم لوگ بھی انہیں حرماں نصیبوں میں سے تھے۔ بھیا لاپتہ ہوئے اور ابا جان اسٹروک کے باعث مردوں سے بدتر۔ عرصے تک ابا جان، امی اور میں جینوا کیمپ میں گلتے سڑتے رہے۔ ابا جان پانچ سال محتاجی کی اذیت جھیل کر بہتی آنکھوں اور مہر بہ لب، حرفِ شکایت لائے بغیر اس بڑے دربار میں حاضر ہو گئے۔ شہانہ زندگی گزارنے والی امی جان نے کپڑے کی فیکٹری میں ملازمت کی اور جو کھم سے مجھے پالا۔ لاکھ کیسے خاک ہوتا ہے میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا۔ بس کچھ کرنے کا جنون ہی تھا جس نے مجھے ہار نہیں ماننے دی۔

قسمت بھی کیسی کیسی چال چلتی ہے۔ جب " اس "کا کن ہو تو ہوا بھی آپ کے موافق۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں میٹرک پاس کر کے اماں کے ساتھ فیکٹری جانے لگی تھی اور ساتھ ہی پرائیویٹ انٹر کرنے کی کوشش میں سرگرم بھی۔ جب بی بی سی سے ایک وفد جینوا کیمپ پر ڈاکومنٹری بنانے آیا۔ اسی ڈاکومینٹری کے ساتھ ساتھ میری قسمت بھی بنتی چلی گئی۔ وہ لوگ میری کھولی کی عکسبندی کر رہے تھے۔ اس آٹھ بائی آٹھ کی کھولی میں ثریا خالہ کے خاندان کے ساتھ ہم ماں بیٹی بھی رہتے تھے۔ ثریا خالہ، کاظم خالو اور ان کے چھ بچے نیچے کمرے میں اور ہم ماں بیٹی اسی کمرے کی آدھی پر چھتی پر۔ جہاں آپ بمشکل بیٹھ سکتے کہ پھر سر چھت سے ٹکراتا البتہ سویا ضرور جاسکتا تھا اگر حبس آپ کو سکون کا سانس بھرنے کی اجازت دے تو!

اسی کھولی کی پلاسٹر اڈھیڑی دیواروں پر میرے کوئلے سے بنے خاکے جابجا تھے۔ میرے ٹوٹے زنگ آلود ٹین کے بکسے میں کاغذ کے ٹھونگوں اور ردی کاغذوں پر میرے انگنت شاہکار بھی ٹھونسے ہوئے تھے۔ جب وہ ڈاکومنٹری نشر ہوئی تو کسی دردمند دل پر میری بے کسی نے دستک دی اور آسٹریلیا سے ایک آرٹ ٹیچر میری تلاش میں ڈھاکہ آیا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش بھی کی مگر میں بے زمین تو کہیں کی نہیں تھی۔ پاکستان نے اپنے ہی محب وطن شہریوں سے کٹھورپنے سے منہ موڑ لیا اور ہمیں ڈس اون کر دیا۔ بنگلہ دیش کے اپنے مسائل کیا کم تھے جو وہ ہم جیسے بے وسائل و خانماں برباد کو گلے لگاتا۔ میں خدا کی اس بے انت زمین میں بے وطن تھی۔ وہ لاوارث جس کا اندراج کسی بھی کھاتے میں نہ تھا۔ سو وہ مجھے ساتھ تو نہ لے جاسکا مگر اپنے رسوخ استعمال کرتے ہوئے ڈھاکہ آرٹ کالج میں میرا داخلہ ضرور کرا گیا۔ میری فیس اور پڑھائی کے دیگر اخراجات اس کی ذمہ داری تھے۔ میرے اس فرشتے کا نام پیٹر ونر تھا۔ کامل دو سال اس نے میرا خرچ اٹھایا پھر اسکالرشپ نے میری راہ کے کانٹے چنے مگر بدقسمتی دیکھیے میری کامیابی کا جشن منانے کو نہ اماں رہیں اور نہ ہی پیٹر ونر۔ ایک کو دق اور دوسرے کو لنگ کینسر نے اچک لیا۔

یونیورسٹی میں میری ملاقات خلیل رحمان سے ہوئی اور اس نے اپنی پلکوں سے میرے سارے درد چن لیے۔ جانے وہ مجھے کن نظروں سے دیکھتا کہ اسے میرے عیب بھی ہنر اور میرا مختصر و کم رو وجود بھی اپسرا دکھتا۔ بلاشبہ یہ کمال و جادوگری صرف محبت ہی کا اعجاز ہے۔ میں نے اتنی تلخ اور بدصورت زندگی گزاری تھی کہ کم سنی ہی میں مجھے ادراک ہو گیا تھا حسن اور میرا کوئی تال میل نہیں۔ ویسے بھی جھلستی دھوپ، سوکھی روٹی اور پنتا بھات، روپ سروپ کی گنجائش ہی نہیں چھوڑتا۔ میرا سارا حسن اور کومل تا میری انگلیوں کی پوروں میں سرایت کر گیا تھا۔ یہ تو بس محبت ہی کا فیضان ہے کہ وہ انسان کو دل کی آنکھ سے جانچتی اور آنکتی ہے۔ خلیل کا کوئی ایسا قریبی رشتے دار تھا نہیں اور ماں باپ بنگلہ دیش کی آزادی کی جنگ میں پاکستان آرمی کے ہاتھوں کھیت رہے تھے۔ سو باقی رہے نام اللہ کا۔ دو تنہا الم زدوں نے مل کر اک نئی دنیا بسا لی۔ اس پرائی دنیا میں ثریا خالہ ہی میری واحد ہوتی سوتی تھیں سو انہوں نے میرا نکاح خلیل سے پڑھوا دیا اور میں جینوا کیمپ کی آٹھ بائی آٹھ کی کھولی سے اٹھ کر عظیم پور کے دو کمروں کے فلیٹ میں آ گئی۔

ہماری زندگی بہت اچھی تھی، کسی مست خرام ندی کی طرح شیتل اور رواں۔ خلیل لیکھک اور میں مصورہ۔ خلیل افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ صداکار بھی تھے۔ شادی کے دوسرے سال آنیشا میری گود میں اور پانچویں سال آروی، بہن کی تنہائی دور کرنے آ گئی۔ میں بہت خوش تھی کہ دونوں بچیاں اپنے باپ کا مکمل عکس تھیں۔ خلیل ہی طرح سحر طراز آنکھیں اور موہنے نقوش۔ میرے سر پر سکھ کی چھپر چھایا صرف چھ سال کی کہانی تھی کہ آروی کی پہلی سالگرہ کا کیک لینے گئے خلیل کو اجل نے گھر لوٹنے ہی نہیں دیا۔ بس پھر میں تھی اور میری مشقت بھری ابھاگن زندگی۔ آنیشا اور آروی کو پالنے اور انہیں زندگی کی تپش سے بچانے میں ایسی منہمک ہوئی کہ کیس کب کیا س ہوئے پتہ ہی نہیں چلا۔

ہسپتال میں جس دن اپنی پہلی نواسی کو گود لیا تو دل نے اطمینان محسوس کیا اور ساتھ ہی اپنے فرائض کی خوش اسلوبی سے بجا آوری پر احساسِ تشکر بھی۔ میرا سفر آسان تو بالکل نہ تھا مگر صد شکر کہ اس سفر میں بے سائبانی اور بھوک شریک نہیں تھی۔ میری بچیوں کا بچپن میرے بچپن جیسا سہا، ترسا اور بلکتا ہوا نہیں تھا۔ باپ کا تو خیر کوئی نعم البدل نہیں

ورنہ انہیں دنیاوی کوئی تکلیف نہ تھی۔ میں گھر اور اسٹوڈیو تک ہی محدود تھی اور میرا سوشل سرکل برائے نام تھا۔ اکلاپا سہارنا آسان نہیں ہوتا، وہ بھی اس کے لیے جس کے پاس رونے کو کوئی کندھا بھی نہ ہو۔ میں نے دل میں قفل لگا کر خود کو روبوٹ بنا لیا۔

آنیشا اور آروی کی شادیوں کے بعد میری تنہائی بے پایاں تھی کہ خالی گھر مجھے کاٹنے لگا تھا۔ اس اکلاپے سے فرار کے لیے میں گھر پر بھی آرٹ کلاسز دینے لگی مگر تنہائی تھی کہ دم گھونٹے دیتی تھی۔ بچیاں اپنی اپنی دنیاؤں میں مصروف و مگن تھیں۔ کبھی کبھار ادھر کا چکر لگا لیتی یا پھر تب جب انہیں بے بی سٹر کے طور پر ماں کی ضرورت ہوتی۔

میں سوچتی تھی کہ اب تو کہانی ختم ہونے والی ہے، میرا آبلہ پائی کا سفر اختتام پذیر ہے۔ اب کیا تردد!! بس جو دو چار گنتی کے سال بچے ہیں وہ نواسے نواسی کے ساتھ کھیلتے گزر جائیں گے پر سوچا چاہا کب ہوتا ہے؟

مجھے کووڈ ہوا اور اس نے واقعی مجھے توڑ دیا۔ تنہا مرنے اور دو گھونٹ پانی کو ترسنے کا خوف میری رگ رگ میں سما گیا تھا۔

میں ایک ہفتے تک آروی کی بات پر جھلستی، کڑھتی رہی اور آج، سالوں پہلے سلمیٰ کی کہی گئی بات کی بازگشت میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ چار سال پہلے، جب سلمیٰ، میری عزیز ترین سہیلی نے آروی کی شادی کی دعوت اپنے گھر رکھی تھی، یہ اسی رات کا قصہ ہے۔ اس رات میں سلمیٰ کی مدد کے غرض سے اسی کے گھر رک گئی تھی۔ کام سمیٹنے کے بعد رات گئے تک ہم دونوں سہیلیاں ٹیرس پر پورے چاند کی ملکوتی چاندنی اور رات کی رانی کی مست مدھر خوشبو سے محفوظ ہوتے ہوئے دنیا جہاں کی باتیں کرتے رہے تھے۔

اس رات سلمیٰ نے مجھ سے کہا تھا کہ اب اپنے بارے میں بھی سوچو۔ تم نے دونوں بچیوں کو ان کی منزلوں پر پہنچا دیا ہے۔ بہت بڑا کام ہو گیا۔ جانے اب تمہارا اور کتنا سفر باقی ہے؟

سو بہتر ہے تم کسی کا سہارا لے لو۔

کیا؟؟؟؟

میں حیران رہ گئی،

کیا کہہ رہی ہو سلمیٰ؟؟

پھر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

تمہارا ابھی جواب نہیں سلمیٰ گویا بوڑھے منہ مہاسے۔

لگتا ہے بالکل ہی پگلا گئی ہو!

میں نے بمشکل ہنسی روک کر کہا۔

ابھی میری بات تمہیں مذاق لگ رہی ہے مگر جب رات کی تنہائی میں خالی دیواروں پر بھوت ناچیں گے نا، تب پتہ چلے گا۔ میرا دیور شمس الحسن تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھ سے پہلے بھی ذکر کیا تھا مگر میں جانتی تھی کہ تم بہت پروٹیکٹیو ماں ہو اور بچیوں کی موجودگی میں کبھی بھی شادی نہیں کرو گی۔ اسی لیے میں نے تم سے ذکر تک نہیں کیا مگر اب آنیشا اور آروی دونوں اپنے اپنے گھروں کی ہوئیں اور تم پر کوئی ذمہداری نہیں تو تم اب تو کم از کم اپنے لیے جی لو۔

سلمیٰ نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

ارے چھوڑ سلمیٰ!! اب بھلا وقت ہی کتنا بچا ہے۔ میں نے گویا ناک پر سے مکھی اڑائی۔

کیوں کیا تم اللہ میاں کے یہاں سے بہی کھاتا دیکھ کر آئی ہو؟

سلمیٰ نے چڑ کر پوچھا۔

میں ہنستی رہی اور بات بدل دی۔

اکثر سلمٰی کی آنکھوں میں سوال جھلکتا اور میں نظریں چرا جاتی۔

خاموش اور منکسر المزاج شمس الحسن میں واقعی کوئی برائی نہ تھی بس میرا یہ خوف کہ دنیا کیا کہے گی؟ پیشِ نظر رہا۔ یہ خیال بھی مد نظر تھا کہ میرا یہ قدم کہیں بچیوں کے سسرال میں ان کے لیے مشکلات نہ کھڑی کر دے۔

آج آروی کے تیکھے اور تلخ لہجے نے مجھے چونکا دیا۔

کیا ساری زندگی کی پارسائی کسی گنتی میں نہیں آتی؟

تنہا عورت ہمیشہ کٹہرے میں کیوں کھڑی رہے؟

ہیلو سلمٰی!!اگر شمس الحسن اب بھی اپنی بات پر قائم ہیں تو ان سے کہنا کل نمازِ عصر کے بعد بیت المکرم مسجد آجائیں ۔

عہد و پیماں

سرور غزالی

کیوو، یورپ کا ایک قدیم شہر ہے، یہاں دریا پتھریلے کناروں سے ٹکراتا ہوا آہستہ آہستہ بہتا ہے، جس پر وہ ایک پل ہے—لوہے کا، مضبوط، اور برسوں کی یادوں سے بھرا ہوا۔ اس پل کی ریلنگ پر سینکڑوں تالے جھولتے ہیں۔ ہر قفل ایک کہانی ہے، اور ہر کہانی ایک وعدہ۔۔۔

کرسٹینا پہلی بار اس پل پر آئی تو شام اتر رہی تھی۔ آسمان پر سنہری روشنی پھیلی ہوئی تھی اور دریا آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا تالا تھا، جس پر دو نام کندہ تھے: کرسٹینا اور سکندر۔ سکندر اس کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا—وہ مسکراہٹ جس میں اعتماد بھی تھا اور ہلکی سی گھبراہٹ بھی۔

کہتے ہیں، یورپ کے کئی شہروں میں یہ رسم برسوں سے چلی آ رہی ہے کہ عشق سے سرشار جوڑا پل پر تالا لگاتا ہے، کنجی دریا میں پھینک دیتا ہے، اور یوں محبت کو ہمیشہ کے لیے ثبت کر دیتا ہے—وقت سے آزاد، فاصلے سے بے نیاز۔

کرسٹینا نے تالا ریلنگ پر رکھا تو اس کے ہاتھ کانپ گئے۔ "کیا واقعی محبت تالے میں بند ہو سکتی ہے؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

سکندر نے دریا کی طرف دیکھا۔ "محبت بند نہیں ہوتی،" اس نے کہا، "تالا تو بس ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم نے ایک دن ایک دوسرے کا انتخاب کیا تھا۔"

کرسٹینا نے مسکرا کر تالا بند کر دیا۔ کلک—ایک مختصر سی آواز، مگر اس میں عہد کی گونج تھی۔ سکندر نے کنجی اٹھائی، ایک لمحہ رکا، پھر دونوں نے مل کر اسے دریا میں پھینک دیا۔ کنجی پانی میں ڈوبی تو لہروں نے دائرہ بنایا، جیسے وقت نے ایک نیا باب کھول دیا ہو۔

سال گزر گئے۔ زندگی نے اپنے رنگ دکھائے—خوشیاں، آزمائشیں، فاصلے، اور واپسی۔ مگر جب بھی وہ شہر آتے، پل پر ضرور رکتے۔ تالوں کے جنگل میں وہ اپنا تالا ڈھونڈتے—کبھی آسانی سے، کبھی مشکل سے—مگر مل ہی جاتا۔

اور یوں، اس پل پر لگے ہر تالے کی طرح، ان کی محبت بھی وقت کے ساتھ مضبوط ہوتی گئی۔ زنگ نے لوہے کو چھوا، مگر وعدے کو نہیں۔ کیونکہ محبت، جب یاد بن جائے، تو کبھی کھلتی نہیں—بس گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔

اور پھر... یورپ کی فضا بدل گئی۔

وہی شہر، وہی دریا، وہی پل—مگر اب خاموشی میں خوف کی گونج تھی۔ آسمان پر سنہری روشنی کے بجائے سیاہ دھواں چھایا رہتا، اور دریا جو کبھی آئینے کی طرح چمکتا تھا، اب راکھ اور ملبے کا عکس اٹھائے بہتا تھا۔ جنگ چھڑ چکی تھی۔

بارود کی بو ہوا میں بسی ہوئی تھی، توپوں کی گھن گرج نے پرندوں کی آوازیں نگل لی تھیں، اور پل—جو کبھی محبت کا گواہ تھا—اب خوف کی لکیر بن چکا تھا۔ ایک رات، جب بمباری نے شہر کی نیند توڑی، ایک زوردار دھماکا ہوا۔ لوہے کی ریلنگ کانپی، تالے بجلی کی طرح اچھلے، اور کئی وعدے پانی میں جا گرے۔

کرسٹینا اور سکندر اس وقت وہاں نہیں تھے۔ وہ کہیں اور تھے—زندگی بچانے کی کوشش میں، ایک دوسرے کو بچانے کی دعا میں۔

جنگ کے دوران جب وہ پر آئے، تو پل آدھا ٹوٹ چکا تھا۔ ریلنگ مڑی ہوئی، لوہا پگھلا ہوا، اور تالوں کا جنگل بکھر چکا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے کھڑے رہے، نظریں اس جگہ پر جمائے جہاں کبھی ان کا تالا تھا۔

وہ تالا...

جسے زنگ نہ مٹا سکا تھا،

جسے وقت نہ توڑ سکا تھا،

جسے فاصلے نہ ہلا سکے تھے—

وہ اب جنگ کے بارود گولوں میں گم ہو چکا تھا۔

کرسٹینا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔" سب کچھ ختم ہو گیا؟ "اس نے سرگوشی کی۔

سکندر نے اس کا ہاتھ تھاما، مضبوطی سے۔" تالا ختم ہوا ہے، محبت نہیں۔"

وہ دریا کے کنارے بیٹھ گئے۔ پانی اب بھی بہہ رہا تھا—خاموش، مسلسل، بے نیاز۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ چیزیں ٹوٹ سکتی ہیں، نشان مٹ سکتے ہیں، مگر جو رشتے دل میں بندھے ہوں، انہیں کوئی بم نہیں توڑ سکتا۔

سکندر نے آہستہ سے کہا": ہم نے محبت تالے میں بند نہیں کی تھی،

ہم نے اسے ایک دوسرے کے دل میں رکھا تھا۔"

اور پہلی بار کرسٹینا کو سمجھ آیا—تالا صرف علامت تھا،

محبت خود ایک زندہ وجود تھی۔

جو پل ٹوٹنے سے نہیں ٹوٹتی،

جنگ سے نہیں جلتی،

اور وقت سے نہیں مرتی۔

پل بکھر گیا،

تالا مٹ گیا،

مگر کہانی باقی رہ گئی۔

کیونکہ بعض محبتیں نشان نہیں چھوڑتیں...

وہ صرف نسلوں کے دلوں میں زندہ رہتی

ابھی وہ وہاں کھڑے سوچ میں گم ہی تھے کہ—بغیر اعلان، بغیر جذبات—ایک فوجی گاڑی آئی۔

اس کے پہیے پل کے زخموں پر چرچراتے ہوئے رکے۔ سپاہی اترے، خاموش، بے تاثر۔ انہوں نے نہ دریا کو دیکھا، نہ آسمان کو۔ ان کی نظریں بس لوہے پر تھیں۔ بچے کھچے تالے، جو دھماکوں سے بچ گئے تھے، ریلنگ سے اتارے جانے لگے۔ کچھ پر نام اب بھی واضح تھے، کچھ پر زنگ نے حروف دھندلا دیے تھے، اور کچھ ایسے تھے جن کی کنجیاں برسوں پہلے خوابوں کے ساتھ دریا میں سو چکی تھیں۔

تالے ٹوکریوں میں گرتے گئے—

کلنک، کلنک—

جیسے وعدے گنے جا رہے ہوں۔

کسی نے نہیں پوچھا کہ یہ تالے کیا تھے۔ کسی نے نہیں سوچا کہ یہ کبھی محبت کی نشانی تھے۔

فیکٹری میں، بھٹیوں کے سامنے، وہ تالے خام مال بن گئے۔ آگ نے ان پر ہاتھ رکھا تو نام پگھل گئے، تاریخ بہہ گئی، اور وعدے دھات میں تحلیل ہو گئے۔ لوہا لوہا رہا—بس شکل بدل گئی۔ اسی لوہے سے گولیاں بنیں، شیل بنے، ہتھیار بنے۔

اور یوں عجیب سا چکر مکمل ہوا:

محبت کے تالے ← جنگ کا ایندھن

وعدوں کی دھات ← نفرت کی زبان

کہیں کسی محاذ پر، ایک گولی نے کسی اور کہانی کو ادھورا چھوڑ دیا—

کسی ماں کا بیٹا،

کسی محبوب کی سانس،

کسی بچے کا خواب۔

اگر کوئی جانتا، تو شاید کانپ جاتا کہ اس گولی میں کبھی دو نام کندہ تھے۔

سالوں بعد، پل پر ایک تختی لگائی گئی:

"یہاں کبھی محبت کے تالے تھے۔"

مگر کسی نے یہ نہ لکھا کہ

وہ محبت

پگھلا کر

جنگ بنا دی گئی۔

کیونکہ تاریخ اکثر یہ بھول جاتی ہے کہ

جنگ صرف شہر نہیں توڑتی—

وہ محبت کو بھی

خام مال سمجھ لیتی ہے۔

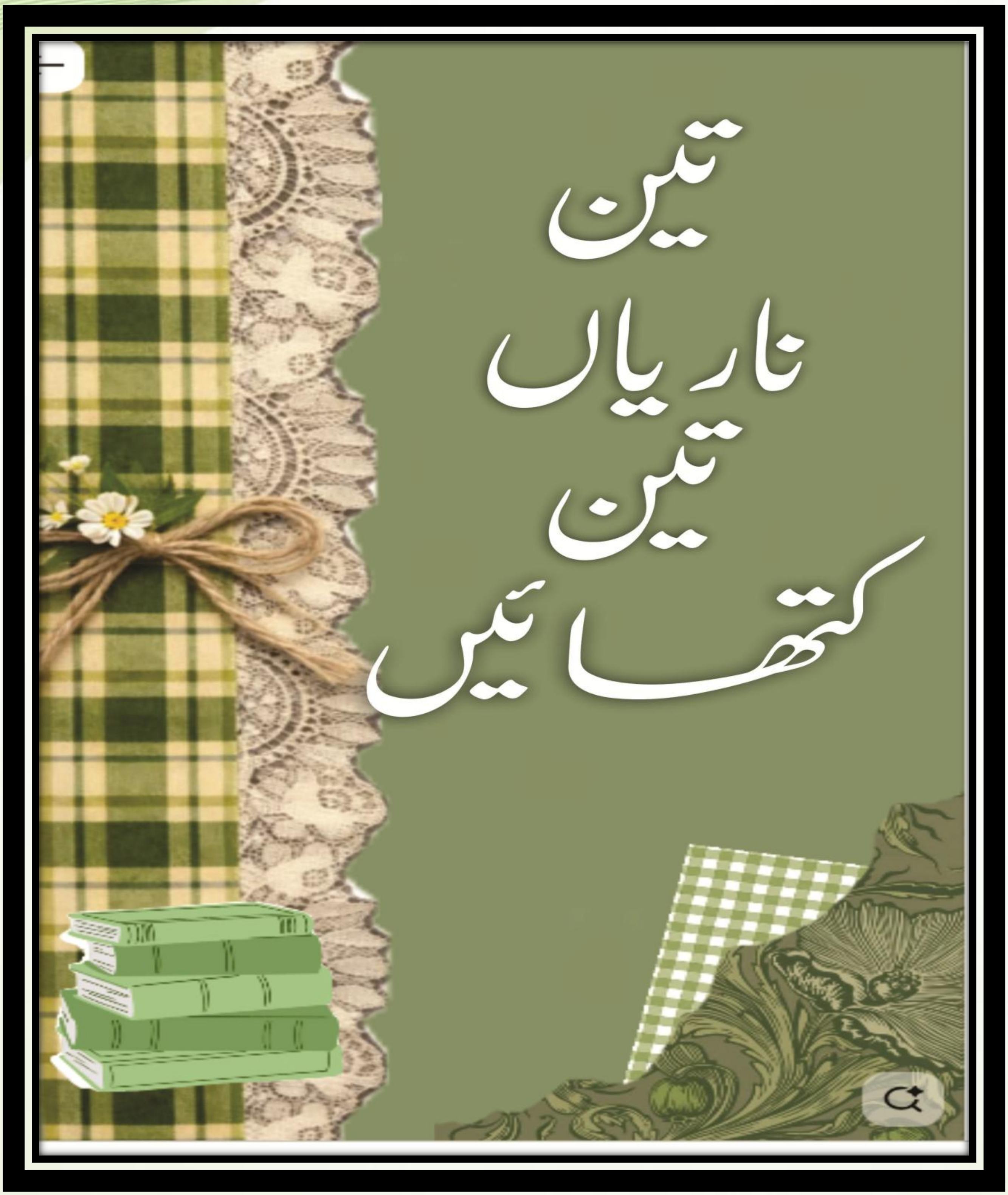
تین
ناریاں
تین
کتھائیں

عبدالشکور پٹھان

الہ آباد کو کون نہیں جانتا۔ پراچین سمے، یعنی پرانے وقتوں میں یہ پریاگ کہلاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ وقت اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ پریاگ بہت زمانے تک الہ آباد رہا اب پھر پریاگ، بلکہ پریاگ راج بن گیا ہے۔

ہاں تو ہم بات کر رہے تھے الہ باد یعنی پریاگ کی۔ پریاگ اپنے سنگم کی وجہ سے مشہور ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، لیکن اگر نہیں جانتے تو جان لیں کہ یہ سنگم تین پوتر دریاؤں گنگا، جمنا اور سرسوتی کا ملاپ ہے جسے تروینی یا تربینی بھی کہتے ہیں۔

جس طرح تروینی پر گنگا، یمنا اور سرسوتی کی لہریں ایک دوسرے کا دکھ بانٹتی ہیں ، یہاں کی فضا میں بھی جانے کتنے زمانوں کی کہانیاں گونجتی رہتی ہیں، ہماری آج کی کہانی میں بھی تین پوتر ناریاں اسی پوتر سنگم پر اپنی کتھائیں سنا رہی ہیں۔ وہ کتھائیں جن کا انت اب تک نہیں ہوا۔

یہاں وہاں کی باتوں کے بجائے آئے کہانی سنتے ہیں۔

آکاش پر سورج کی آخری لالی دم توڑ رہی تھی اور سنگم کے کنارے اندھیرا دھیرے دھیرے اپنا راج جما رہا تھا۔ یہاں ایک پرانا اور وشال برگد کا پیڑ اپنی جٹائیں زمین پر پھیلائے یوں کھڑا تھا جیسے صدیوں کے راز اس کے سینے میں دفن ہوں اور وہ ان کے بوجھ تلے جھکا ہوا ہو۔ تربینی کی لہروں میں ایک عجیب سی تڑپ تھی جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

اسی برگد کی چھاؤں میں تین ناریاں ایک دوسرے کے سامنے زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھی ہیں۔ دور دور تک بس جنگل کی سرسراہٹ اور پانی کا شور ہے۔ سب سے پہلے سیتا نے سنگم کی مٹی کو چھوا، اس کی آنکھوں میں دھرتی جیسا ٹھہراؤ اور دکھ تھا۔ اس کی ایک جانب دروپدی اپنے کھلے بالوں کو ہوا میں لہرائے بیٹھی تھی جن کی لٹیں کسی طوفان کا پتہ دیتی تھیں۔ اور ان دونوں کے سامنے کھڑی شکنتلا شاید گنگا کی لہروں میں اپنی کھوئی ہوئی مدریکا (انگوٹھی) کو ڈھونڈ رہی تھی۔

وہاں کوئی راجہ، کوئی رشی، کوئی منش تھا نہ کوئی سماج تھا بس وہ تین تھیں اور ان کی ادھوری، بے انت کتھائیں تھیں،

سیتا نے کہرا سانس لیا اور خاموشی کو توڑتے ہوئے بولی " اس تٹ (کنارے) پر جہاں ندیاں ایک دوسرے میں سما جاتی ہیں آؤ ہم بھی اپنے دکھوں کو ایک دوسرے میں سمو دیں ۔ آج ہمیں کوئی ٹوکنے والا نہیں نہ کوئی ہماری پوترتا کی گواہی مانگے گا"۔

دروپدی نے اپنے بالوں کی گرہ کھولی اور دریا کی اور دیکھتے ہوئے بولی "سیتا، یہ ندیاں بھی ہماری طرح ہیں، بہتی رہتی ہیں، راستہ بناتی ہیں لیکن تٹ کے بندھنوں (کناروں) میں قید رہتی ہیں۔ میری کتھا تو اس تند و تیز، یمنا، جیسی ہے جو اپنے اپمان کا بدلہ لینے کے لیے بے چین ہے۔"

شکنتلا نے لہروں سے نظریں ہٹا کر ان دونوں کو دیکھا اور دھیمے سے بولی " اور میری کتھا اس پوشیدہ سرسوتی جیسی ہے جو سب کے سامنے ہو کر بھی کسی کو دکھائی نہیں دیتی، جس کا روپ سروپ ہی بھلا دیا گیا ہو" ۔

پھر اس پراتن (پرانے) برگد کے نیچے، ڈھلتی شام کے سناٹے میں تینوں نے اپنی کہانی سنانا شروع کی جو اتہاس کے پنوں میں کبھی پوری طرح لکھی ہی نہیں گئی۔

پہلی کتھا

سیتا نے مٹی کی طرف دیکھا اور دھیمے سے بولنا شروع کیا۔

"میری کتھا ایک ریکھا سے شروع ہوئی اور اگنی پر ختم ہوئی۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ میں پوتر ہوں یا نہیں؟ میں نے دہکتے انگاروں پر چل کر اپنی پوترتا کی ساکشی (گواہی) دی لیکن سماج کے ایک شک نے میری اس کٹھن پریکشا کو جھٹلا دیا۔ مجھے گربھ وتی (حاملہ) ہونے کی سزا میں بن میں بھیج دیا گیا جہاں میں نے اکیلے پن کو اپنا جیون ساتھی بنایا۔ میری پیڑا (دکھ) یہ نہیں تھی کے راون نے میرا اہرن (اغوا) کیا۔ میرا دکھ یہ تھا کہ جس کے لیے میں نے اگنی پار کی اسی نے سماج کے ڈر سے مجھے ٹھکرا دیا۔ اب میرے پاس واپس لوٹنے کے لیے کوئی راج محل نہیں ہے۔ صرف یہ دھرتی ہے جس کی کوکھ سے میں جنمی تھی اور اسی میں سما جانا چاہتی ہوں۔

دوسری کتھا

دروپدی نے اپنے کھلے بال سمیٹے اور کسیلی سی مسکراہٹ سے کہا:

"سیتا تمہیں تو تنہائی ملی، مجھے تو بھری سبھا میں تماشہ بنایا گیا۔ میری کتھا اس بھون کی ہے جہاں پانچ ویر پتی، بڑے بڑے رشی منی اور نیائے (انصاف) کے گیانی بیٹھے تھے لیکن جب میرے کپڑے نوچے جا رہے تھے تو سب کی زبانیں بند تھیں۔ میں کوئی چیز یا سامان نہیں تھی جسے جوئے میں ہار دیا جاتا۔ میں ایک جیتی جاگتی ناری تھی جسے پرشوں (مردوں) کے اہنکار نے داؤ پر لگا دیا۔ مجھے وہ بے بسی نہیں بھولتی جس سے اس سبھا میں ہر بزدل کی آنکھوں میں دیکھا اور وہاں صرف خالی پن پایا۔ میرا دکھ صرف کوروں سے نہیں اس سماج سے تھا جو ناری کو اپنا ادھیکار نہیں دیتا۔

تیسری کتھا

شکنتلا نے اپنی خالی انگلی کو چھوا اور دھیمے سے بولی:

"میری کتھا وشمرتی (بھول جانے) کی داستان ہے۔ پریم کرنا کوئی اپرادھ نہیں تھا لیکن پریم کی نشانی کا کھو جانا میرے جیون کا سب سے بڑا دربھاگیہ بن گیا۔ میں راجہ کے دربار میں اپنا ادھیکار مانگنے گئی تھی، اپنے بالک کے پتا کو کھوجنے گئی تھی، لیکن اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میں کوئی انجانی ہوں۔ ایک ناری کے لیے اس سے بڑا دکھ کیا ہوگا کہ اس کا پتی اسے پہچاننے سے مکر جائے اور سب کے سامنے اس کا اپمان کر کے نکال دے؟ میرا دوش صرف یہ تھا کہ میں نے ایک راجہ کے وچن پر وشواس کیا اور شراپ (بددعا) کے بوجھ کو اکیلے اپنے کاندھوں پر اٹھایا۔"

تینوں شانت ہو گئیں۔ سرسراتی ہوا میں ان کی آہیں ایک دوسرے میں مل گئیں۔ سیتا، دروپدی اور شکنتلا کی کتھائیں دراصل ایک ہی کہانی ہے۔ ناری کی کہانی تب سے اب تک یہی چلی آ رہی ہے لیکن اتہاس کے پنوں کو منش جاتی (مردوں کی ذات) ہمیشہ ایک منورنجن کے طور برتتی ہے۔

آج بھی، جب کوئی ناری کسی لکشمن ریکھا کو پار کرتی ہے یا کسی نیائے بھون میں اکیلی کھڑی ہوتی ہے تو یہ تینوں کتھائیں پھر سے جی اٹھتی ہیں۔

ٹاور

محمودہ قریشی (آگرہ)

یہ سمندر کی روانی، سبزوں کی لہلاہٹ، چڑیوں کی چہچاہٹ، سمندر کے کنارے پاس آتیں لہریں جس کو چھونے کو بے تحاشہ دل مچلتا ہے۔ نیلے آسمان کے نیچے سمندر کے ہی کنارے درختوں کے سہارے اس قدرتی مناظر کا نظارہ کرنے کا اپنا ہی ایک لطف ہے۔ لیکن یہ کیا،،، یہاں کوئی ملاح دور دور تک کیوں نظر نہیں آرہا ہے۔؟
جب زندگی بغیر ملاح کے نہیں چل سکتی تو یہ ہاوس ووٹ کیسے چل سکتے ہیں۔ تو کیا ہم بغیر ملاح کے کیا یہاں ہاوس ووٹینگ نہیں کر سکتے ہیں ۔؟ میں نے یوہی ادھر ادھر نظر دوڑائی اور بہت دور مجھے چاروں طرف لوہے کی سلاخوں جیسا زنجیر نما ایک لوہے کا ٹاور نظر آیا شاید وہاں کچھ اور لوگ بھی نظر آرہے ہیں لیکن یہ سب بیچ سمندر کی طرف کیوں جارہئے ہیں۔؟
شاید مزید گوہر کی تلاش میں ہو۔ ظاہر ہے گوہر آب دار تلاش کرنا ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے۔ بغیر کچھ تفصیل جانے میں بھی ان کے ہم رکاب ان کو آواز دیتے ہوئے ان لہروں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ اور مزید اتنی دور نکل آئی کہ جہاں سے لوٹنا خود کو سمندر میں غرق کرنے جیسا تھا۔ لیکن یہ کیا لہروں کی روانی اور تیز ہوتی جا رہی ہے۔ اور جیسے جیسے میں آگے بڑھتی گئی وہ لوہے کا ٹاور مجھ پر جھک کر میرے اتنا قریب آ گیا کہ شاید کبھی ٹیلر ماسٹر بھی میرے اتنے قریب نہیں آیا ہوگا۔
جیسے جیسے ٹاور مجھ پر جھک رہا تھا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ٹاور سجدہ ریز ہے ۔ جیسے چاند ستارے سجدہ کرتے تھے حضرت یوسف کو ۔ دھیرے دھیرے وہ مجھ پر جھکتا رہا۔ اس نے مجھے اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا۔ اور پوری طرح مجھے اپنی گرفت میں لیتا رہا۔ اس کی پکڑ مجھ پر اتنی سخت ہو چکی تھی کہ میں خود سے کچھ بھی حرکت و عمل نہیں کر سکتی تھی۔
ایسا محسوس ہونا فطری تھا۔ جیسے اس نے مجھے پوری طرح اپنی باہوں میں بھر لیا ہے۔ اور میں ٹوٹ کر بکھرنے والی ہوں۔ یہ چاہ تھی کہ یہ صرف میں محسوس کر رہی تھی واقعی اس کی گرفت مجھ پر سخت تھی۔ ظاہر ہے ہستی اپنے دام میں لے لیتی ہے ۔ کچھ محسوس بھی نہیں ہونے دیتی کب بچپن سے جوانی ، اور پھر پیری کو پہنچ جاتے ہیں۔ معلوم ہی نہیں چلتا ۔ اب میں پوری طرح اس کے حصار میں تھی۔ اور جیسے ہی وہ ٹاور بیچ سمندر تک پہنچا تو میرا یہ احساس دوبالا ہو گیا کہ میں اب پانی کو چھو بھی نہیں سکتی ہوں۔ اور اس تیزی سے اس میں پنکھ لگ گئے ہیں کہ اوپر اٹھتا ہی چلا جا رہا ہے ۔ میں نفس پتھر کا مجسمہ بنی صرف سرد آہیں بھرتی رہی۔ مجھے بارہا یہ احساس ستا رہا تھا کہ یہ ٹاور مجھے کہاں لے کر جانے والا ہے۔؟ یا پھر آج میرا کام تمام ہونے والا ہے ۔ ایک حیرت انگیز خوشی کے ساتھ ڈر وخوف کی دنیا غالب آ رہی تھی ۔
گر زندہ بچی تو کسی نئی دنیا کی سیر کرانے پر آمدہ ہے۔ اور اس ٹاور کی رفتار اس قدر تیز ہو گئی کہ میری سانسیں دم بھرنے لگی ۔ ان سرد آہوں کا ذرا اثر محسوس نہیں ہو رہا تھا ۔ وہ ٹاور پتھروں کو چیرتا سٹاک سٹاک، پہاڑوں سے ایسے گزر رہا تھا جیسے کسی کھلونے میں چابی بھر دی گئی ہو ۔ جو رکنے کا نام نہیں لے رہی ۔ ہمارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔ ہوتا تو وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے اور قسمت میں لکھا ہوتا ہے ۔ مزید اضافہ تھا کہ راستے میں آنے والی ہر شے چکنا چور ہو جائے

گی ۔نصف لوہے کا مجسمہ ایسے پلٹی مارتا ہے ۔ جیسے فٹ بال پلٹی مارتی ہے۔اور مسلسل لڑھکتی رہتی ہے کہ کسی ایک مقام پر روکتا ہی نہیں چلتا ہی چلا جا رہا تھا۔اس تیزی سے پانی کو چیر کر ایک عام سی وادی کو لانگھ کر نہ جانے کس قلعے میں داخل ہو چکا تھا۔جو میرے لئے کسی عجوبے سے کم نہیں تھا۔اس قلعے کی دیواریں لال چمک دار پتھر کی تھی؟اس طرح کے قلعے تو بادشاہ اکبر نے بھی تعمیر نہیں کرائے ہیں ۔اس قلعے کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ ٹاور سانپ کی طرح لہراتے ہوئے ایک دیوار کو چیر کر دوسری دیوار میں داخل ہو جاتا ہے۔آخر کار قلعے کی چوتھی منزل کا نظارہ دیکھ کر میری حیرت دوبالا ہو گئی جب مجھے اس قلعے میں موجود لوگوں کی تعداد پر نظر پڑی یہ ایک دوسرے سے نہ آشنا لوگ نہ جانے کس فراق میں گم تھے۔اس بھیڑ میں موجود چھوٹے قد کی ایک لڑکی کو دیکھ کر نہ جانے دل اس کی طرف کیوں متوجہ ہوا۔کہ وہ خود میری طرف لپکی اور ٹاور کے اوپر ہی سے اس نے مجھے گلے لگانے جیسی کیفیت کے ساتھ ہلکی سی مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔-میری محسنہ،میری بہن،میری چھوٹی بہن کہنے کے لئے میرے الفاظ میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے ۔اور دور سے ہی دو بزرگ سفید لبادے میں ملبوس شخصوں کو دیکھ کر میری آنکھیں نم ہو گئی ۔ اس میں سے ایک داڑھی والے شخص کی زبان سے استقبالہ الفاظ کی بلند خوانی سن کر بھی میری زبان الفاظ کی ادائگی میں ماجور تھی ۔ ۔لیکن نہ جانے کیوں میری طبیعت ان کی طرف مائل ہو رہی تھی۔یادوں کی راکھ میں ذہن کیا ٹٹول رہا تھا ۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے برسوں کی آشنائی ہو اور وہ ہاتھ جو مجھے ٹاور کے باہر سے ہی دعائیہ کلمات سے نوازتے ہوئے نظر آرہے تھے ۔ان ہاتھوں کی کھردری انگلیوں کی لمس نے ایسا کیا دیا جس کا مجھے اندازہ بھی نہیں تھا۔؟لیکن ملاقات کا لطف تو تب پیدا ہوتا جبکہ میری زبان میرا ساتھ دیتی۔خیال اور لفظ ذہن میں تو رقص کر رہے تھے لیکن بس زبان سے ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔؟ گلے شکوے تو تب ہوتے جب زبان ساتھ دیتی۔ٹاور تو نہ جانے اس منزل پر بھی روکنے کا نام نہیں لے رہا ۔برابر گردش کرتے ہوئے کہاں پہنچنے کے فراق میں تھا۔کہ وہ لال پتھر کے قلعے سے نکل کر ایک سفید رنگ کی گنبد و مہراب و مینار نما عمارت میں داخل ہونے کے لئے کسمسانے لگا۔ اس قلعے کے حصار سے نکل بھی نہیں پائی تھی کی اس خوبصورت سفید دودھیہ عمارت نے میری پوری توجہ کھینچ لی ۔ جس کو دیکھ کر آفرین کہنے کو طبیعت چاہتی ہے۔اس عمارت کو دیکھ کر مجھے حیرت تو بالکل بھی نہیں ہوئی چونکہ یہ میرے لئے عجوبہ نہیں تھی بلکہ میں اسے دیکھ کر ہی جوان ہوئی تھی۔اس گنبد و مہراب کے چار میناروں پر ٹکی سفید سنگ مرمری عمارت کی خوبصورتی کو دیکھ اکثر لوگ دانتوں تلے انگلی دبا لیتے ہیں ۔ لیکن ذہن و دل اس طرف مائل نہیں تھا مائل تھا تو صرف یہ جاننے کے لئے کہ آخر منزل و مقصود کیا ہے؟ اب کوئی نیا درد ہونے والا ہے۔؟ لیکن جیسے جیسے ٹاور اس عمارت کے قریب پہنچتا جا رہا تھا۔ویسے ویسے میری آنکھیں اس روشنی کی تاب لانے سے قاصر نظر آ رہی تھیں۔اور اچانک ہی اس سفید روشنی سے بھی زیادہ چمک دار سات گیندوں نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ان گیندوں کی تپش اور چمک سے لوہے کا ٹاور آگ کی طرح دہک اٹھا تھا ۔ مجھ سے لپٹی سلاکھے میرے جسم کو جلا کر راکھ کر رہی تھی ۔ اور میرے بدن کا ایک ایک حصہ جل بھون کر گرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔اس کی گرفت اگر ایسے ہی سخت رہی تو میرا ایک ایک عضو چھلنی ہو جائے گا۔مجھے یہ گمان ہی نہیں بلکہ یقین ہو چلا تھا کہ میں اب اس ٹاور کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتی،چونکہ یہ مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے ۔ٹاور مسلسل اپنی اسی چال سے سب ہی گیندوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے اسی دودھیہ عمارت نما ٹھنڈی گیند میں داخل ہو گیا۔شاید اس کی ٹھنڈک سے میرے زخموں کو راحت مل سکے۔جیسے زخموں پر اکسیر مل دی گئی ہو۔زخموں کی جلن پر برف کی سی ٹھنڈک محسوس ہوئی تو میری نظریں سفید چاندنی کے اس شہر کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی کہ سفید براق سا جامہ پہنے دو شخصوں کو اپنے قریب آتا دیکھ میری نبضوں کی رفتار پھر تیز ہو گئی ۔

"وقت کیا ہوا ہے؟

میری نماز نکل رہی ہے طلوع آفتاب کا منظر نظر آرہا ہے ۔"؟ میں نے ان کو اپنی طرف مخاطب پا کر ان سے ہی سوال کیا ۔

وقت کیا ہوا ہے آپ کے پاس گھڑی ہے ؟

ذرا دیکھ کر بتائے کہ کیا وقت ہو رہا ہے؟ "

"بیٹا یہاں کوئی گھڑی ، کوئی کلنڈر نہیں ہوتا ۔ "انھوں نے مجھ سے محبت بھرے لہجے میں کہا ۔

"پھر آپ وقت کیسے دیکھتے ہیں ابّا؟ "میں نے سوالیہ نظروں سے کہا ۔

پہلے تو ان کی پریشان کن حالات کو دیکھ کر حیرانی محسوس ہوئی لیکن جلد ہی میری تجسس نے ان کی توجہ کھینچ لی اور انھوں نے کہا،"وقت ، کیا ہوا ہے، میں تمہیں سمجھاتا ہوں اس وقت کی تفصیلات اس کائنات کے خالق نے جب سے دنیا بنائی ہے۔تب ہی سے سورج،چاند،ستاروں کی تعمیر بھی کی جس کی پیدائش آج تمہاری زبان میں پندرہ عرب برس پہلے تسلیم کیا جاتا ہے۔یہ جو چمکیلیں تارے تم دیکھ رہی ہو اور وہ دور سنہری چمکیلی روشنی جس کو تم یا میں ہی نہیں عالم انسان میں دیکھنے کی تاب کوئی نہیں لا سکتا ہے۔تم صرف اتنا سمجھ لو کہ یہ تمہارا سورمنڈل ہے۔اور اس کے چکر لگانے والے یہ آٹھ گرہے ہیں۔پہلا جو دودھ سے بھی زیادہ سفید ہے'رقعیہ' ،لوہے کی روشنی سا چمکتا'فیدوم یاماعون'،اسی طرح سے تانبے سے بنا'ملکوت'ہاریون'اور آج جہاں تم کھڑی ہو سفید چاندی کی طرح چمکتا"زاہرہ'ہے۔جس کی ٹھنڈک تم محسوس بھی کر سکتی ہو۔سرخ سونے سے بنا" مزینہ یا مسہرہ "،اسی طرح" خالصہ "جو چمکدار موتیوں سے بنا ہوا ہے۔اور آخری" لابیہ یادامعہ " ہے جو سرخ یاقوت سے بنا ہے اسی میں بیت العمور ہے ۔

یعنی ان کو تم سات آسمان بھی کہہ سکتی ہو ۔جو طے بہ طے روحانی اور رسمی علامت ہے،جو کائنات کی نمائندگی کرتے ہیں جو گولائی لیے ہوئے ہے۔اسی طرح سات زمینیں ہیں۔لیکن تمہاری زبان میں ان ہی گرہوں میں پانچویں نمبر پر آتی ہے تمہاری دنیا جس پر تم رہتی ہو جو بھی بناوٹی انداز سے بالکل گول ہے۔اس کے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔سمندر ہی سمندر اور تمہاری دنیا ستر ہ(70 (فیصد پانی میں صرف تیس فیصد زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔جس کی مسافت طے کی جا سکتی ہے۔لیکن تمہاری دنیا خود رقص میں مصروف رہتی ہے۔یہ چمکیلا گولا جسے تم سورج کہتی ہو یہ چمکیلے گولے کی مسافت طے کرنے میں تمہارے وقت کے مطابق " تین سو پیسٹھ دن، پانچ گھنٹے، اڑتالیس منٹ اور چھیالیس سیکنڈ لیتی ہے۔یہ دنیا اپنے ہی ایام پر بھی چکر لگاتی رہتی ہے۔مغرب سے مشرق کی طرف اس کی رفتار رہتی ہے۔جس سے تمہارے یہاں دن اور رات ہوتے ہیں ۔ اور سورج کے چکر لگانے سے ہی ماہ و سال اور موسم بدلتے ہیں ۔اس نظام عالم سے تمہیں وقت کی تبدیلی کا
علم ہوتا رہتا ہے۔

جس کو تم نے ایک الیکٹرونیک چیز گھڑی کا نام دے دیا ہے۔اور آج جہاں تم کھڑی ہو وقت اور دن بدلنے میں بدلتے اس چاندی کے شہر جس کو چاند نگر کہتے ہو جس پر آج چندریان۔ 3_ بھی تم لوگ پہنچا چکے ہو یہ خود تمہاری دنیا کے چکر لگاتا ہے۔ اس طرح سورج،چاند اور تمہاری دنیا اور دیگر تارے ایک دوسرے کی مسافت طے کرتے رہتے ہیں۔جس سے دن رات صبح شام اور موسم بدلتے رہتے ہیں۔ان سبھی چیزوں کا ہمیں بخوبی علم ہے۔پھر ہمیں وقت دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔؟ "

میں نے نفی میں سر ہلانا چاہ لیکن ٹاور کی گرفت مجھ پر اتنی سخت تھی کہ میں سر ہلانا تو دور انگلی بھی نہیں ہلا سکتی تھی۔اور انھوں نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا

"اچھا اب نماز کا وقت ہو چلا ہے۔میں چلتا ہوں ۔"

میری آنکھوں سے زار و قطار آنسوں گرنے لگے اور میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پھر ان سے کہا

ابّا آپ نے مجھے جغرافیہ کا علم تو بخوبی بتا دیا۔شاید اتنا اچھے سے مجھے میرے اسکول ٹیچر نے بھی کبھی نہیں سمجھایا تھا۔لیکن مجھے ایک بات اور بتا دیجئے جو مجھے اندر سے پریشان کیے ہوئے ہیں۔اس سے پہلے جو قلعہ پڑا تھا جس میں میرے کچھ آشنہ چہرے بھی تھے۔مجھے نہیں یاد پڑتا تھا کہ وہ لوگ میرے کون تھے۔لیکن ابّا اتنا تو میں بخوبی جان ہی گئی ہوں کہ وہ میرے عزیز و اقرباء سے کچھ زیادہ ہی تھے۔لیکن بالکل بھی یاد نہیں پڑتا کہ وہ کون تھے ۔"

اتنا کہہ کر میں اپنی بے بسی پر زاروقطار رونے لگی۔اس شخص کو بھی میری بے بسی پر رحم آگیا ۔ وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے ۔ میری معصوم سی روتی ہوئی صورت پر رحم کھا کر گویا ہوئے کہ یہ سب کن "فیاکون "کے محتاج ہیں۔عالم ارواح کے گنہگار عالم برزخ میں سزا پاتے ہیں۔لیکن انسان اتنا ناشکرا ہے کہ کسی بھی چیز کی تاب نہیں لا سکتا۔یہ جو قلعہ تم نے دیکھا ہے۔وہاں ارواحیں رہتی ہیں۔چونکہ روح قبض کرتے ہی اچھے سے اچھا لباس دے کر ان کو یہاں پہنچا دیا جاتا ہے ۔

جس قلعہ میں تم نے ان لوگوں کو دیکھا وہ تمہارے اپنے تھے۔تمہارے والد بزرگوار، تمہاری بہن, تمہارے چچا، پھوپھی اور دادادادی نانانانی وغیرہ ۔وہ لوگ تمہیں پہچان گئے تھے۔اس لئے ان بلاخانوں میں تمہارااستقبال کر رہے تھے ۔لیکن انسان ہر چیز سے محروم ہے۔افسوس صد افسوس اللہ نے اسے اپنے ہر دلعزیز کو بھی بھولا دیا۔اور تمہیں وہ چہریں بھی یاد نہ رہے۔؟

حق ہمیشہ رہے گا باطل مٹ جائے گا۔سب فنا ہونے والا ہے۔فقط اللہ کا نام رہ جائے گا،فقط اللہ کا نام رہ جائے گا ۔"کلِ نفسی ذائقتہ موت " ہر جاندار چیز کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔وہ شخص یہ کہتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھ گئے لیکن میں مزید کچھ کہنے سے قاصر تھی۔میری زبان میرا ساتھ نہیں دے رہی ہر جان دار چیز کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔میں نے بھی دل ہی دل میں ان ہی الفاظ کو مزید دہرانا شروع کر دیا ۔یہی الفاظ میں نے نہ جانے کتنی بار دہرائے۔جیو جیو میں ورد کرتی وہ وہ ٹاور مجھ پر سخت ہو تا جاتا۔حتی کہ میرے جسم میں جان تک باقی نہیں رہی۔اور میرا یہ جسم اس ٹاور کی گرفت سے کب آزاد ہوا؟۔مجھے آج یہ کہہ لینے دیجئے کہ اس ٹاور کی گرفت موت کی سختی سے کم نہ تھی ۔یہ چاند، یہ سورج، یہ ستارے سب فنا ہو جائے گے ہر شے کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔انسان ٹاور کی زندگی کو محبوب رکھتا ہے اس ٹاور کی زندگ سے موت بہتر ہے ۔

4 جولائی

محسن علی

میک امریکہ گریٹ آگین سے پہلے گریٹ امریکہ کا نعرہ جب بلند ہوا تھا تب شاید اُس شخص نے قلم رکھتے وقت ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا ہوگا کہ دو سو پچاس برس بعد بھی دنیا اس کے لکھے ہوئے نام کو یاد رکھے گی۔ اُس نے شاید صرف ایک کاغذ پر اپنے چند حروف ثبت کیے تھے، مگر وقت نے انہی حروف کو ایک نئی ریاست کی بنیاد میں بدل دیا۔ اُس لمحے نہ کوئی فتح کا جشن تھا، نہ توپوں کی سلامی، نہ آسمان پر آتش بازی۔ صرف چند لوگ تھے، ایک کمرہ تھا، چند صفحات تھے، اور ایک ایسا فیصلہ تھا جس کے بعد واپسی کا کوئی راستہ باقی نہیں رہنا تھا۔

یہ کہانی دراصل چار جولائی 1776ء سے شروع نہیں ہوتی۔
اس کی ابتدا اُس دن ہوئی تھی جب برطانیہ نے ایک جنگ تو جیت لی، مگر اپنی سب سے قیمتی نو آبادی کو کھونے کی بنیاد بھی رکھ دی۔
1756ء سے 1763ء تک برطانیہ اور فرانس کے درمیان سات سالہ جنگ لڑی گئی۔ یہ جنگ صرف یورپ تک محدود نہ رہی بلکہ شمالی امریکہ، کیریبین، افریقہ اور ہندوستان تک پھیل گئی۔ اسی لیے کئی مؤرخ اسے جدید تاریخ کی پہلی حقیقی عالمی جنگ قرار دیتے ہیں۔ جب جنگ ختم ہوئی تو فاتح برطانیہ تھا۔ فرانس اپنی کئی نو آبادیوں سے محروم ہو چکا تھا، برطانوی سلطنت پہلے سے زیادہ وسیع ہو گئی تھی، مگر اس کامیابی کی قیمت شاہی خزانے نے ادا کی۔ جنگ نے برطانیہ کو قرضوں میں ڈبو دیا تھا، اور سلطنت کو چلانے کے لیے مزید دولت درکار تھی۔
1760ء میں نوجوان بادشاہ جارج سوم تخت پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ ایک مضبوط اور متحد سلطنت کا خواہش مند تھا۔ لندن میں بیٹھے وزراء کا خیال تھا کہ شمالی امریکہ کی تیرہ نو آبادیاں بھی سلطنت کے اخراجات میں حصہ ڈالیں، کیونکہ برطانوی فوج نے انہی علاقوں کے دفاع کے لیے جنگ لڑی تھی۔ یہ فیصلہ لندن میں شاید ایک معمول کی مالی پالیسی سمجھا گیا، مگر بحر اوقیانوس کے اُس پار رہنے والوں نے اسے اپنے مستقبل کا سوال سمجھا۔
شمالی امریکہ کی یہ تیرہ نو آبادیاں آج کے امریکہ کی بنیاد تھیں۔ یہاں رہنے والے لوگ خود کو برطانوی شہری سمجھتے تھے۔ وہ بادشاہ سے نفرت نہیں کرتے تھے، نہ ہی ایک الگ ملک بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ اگر ان سے ٹیکس لیا جا رہا ہے تو انہیں برطانوی پارلیمان میں نمائندگی بھی دی جائے۔ ان کا مطالبہ آزادی نہیں، انصاف تھا۔
1765ء میں اسٹامپ ایکٹ نافذ ہوا۔ قانونی دستاویزات، اخبارات، رسائل، تجارتی معاہدوں، حتیٰ کہ عام کاغذات پر بھی شاہی محصول عائد کر دیا گیا۔ اس کے بعد ٹاؤنشینڈ ایکٹس آئے، جن کے تحت شیشہ، کاغذ، رنگ، سیسہ اور دوسری درآمدی اشیاء پر محصولات لگائے گئے۔ لوگوں کو محسوس ہونے لگا کہ ان کی جیبوں پر نہیں، ان کے حقِ رائے پر ٹیکس لگایا جا رہا ہے۔

پھر ایک جملہ پورے براعظم میں گونجنے لگا۔
"نمائندگی کے بغیر ٹیکس نہیں۔"
یہ صرف ایک نعرہ نہیں تھا، بلکہ آنے والے انقلاب کی بنیاد تھا۔
1770ء میں بوسٹن کی ایک سڑک پر کشیدگی نے خون کی صورت اختیار کرلی۔ برطانوی فوجیوں اور شہریوں کے درمیان تصادم ہوا، گولیاں چلیں، اور چند لوگ مارے گئے۔
یہ واقعہ بوسٹن قتلِ عام کہلایا۔ مرنے والوں کی تعداد شاید بہت زیادہ نہیں تھی، مگر اس واقعے نے لوگوں کے ذہن بدل دیے۔ پہلی بار بہت سے نو آبادیاتی باشندوں نے محسوس کیا کہ لندن اب انہیں رعایا نہیں، حکم ماننے والی آبادی سمجھتا ہے۔

تین برس بعد برطانوی حکومت نے ٹی ایکٹ منظور کیا۔ چائے پر محصول برقرار رکھا گیا۔ بظاہر یہ ایک معمولی معاشی فیصلہ تھا، مگر اس کے پیچھے ایک سیاسی پیغام چھپا تھا: پارلیمان کو حق حاصل ہے کہ وہ نو آبادیات پر ان کی مرضی کے بغیر بھی قانون نافذ کرے۔
16 دسمبر 1773ء کی رات بوسٹن کی بندرگاہ پر کچھ لوگ مقامی قبائل کا بھیس بدل کر برطانوی جہازوں پر سوار ہوئے اور چائے کی سینکڑوں پیٹیاں سمندر میں پھینک دیں۔
چائے پانی میں بہہ گئی، مگر اس کے ساتھ ہی برطانیہ اور نو آبادیات کے درمیان اعتماد بھی ڈوب گیا۔ یہی واقعہ تاریخ میں بوسٹن ٹی پارٹی کے نام سے محفوظ ہے۔
لندن نے سخت جواب دیا۔ بندرگاہ بند کر دی گئی، فوج بڑھا دی گئی، اور ایسے قوانین نافذ کیے گئے جنہیں نو آبادیات کے لوگوں نے ناقابلِ برداشت قوانین کا نام دیا۔ مگر دباؤ نے خوف پیدا کرنے کے بجائے اتحاد پیدا کر دیا۔
1774ء میں پہلی بار مختلف نو آبادیات کے نمائندے فلاڈیلفیا میں جمع ہوئے۔ یہ پہلی کانٹینینٹل کانگریس تھی۔ ابھی بھی اکثر لوگ آزادی نہیں چاہتے تھے۔ وہ آخری مرتبہ برطانیہ کے ساتھ مفاہمت کی امید رکھتے تھے۔ مگر وقت دونوں کے درمیان فاصلے بڑھا چکا تھا۔
19 اپریل 1775ء کو لیکسنگٹن اور کانکورڈ میں پہلی گولیاں چلیں۔ آج تک کوئی یقین سے نہیں جانتا کہ پہلی گولی کس نے چلائی، مگر اس کی آواز پورے براعظم میں سنی گئی۔
اختلاف اب احتجاج نہیں رہا تھا، جنگ بن چکا تھا۔
اسی سال دوسری کانٹینینٹل کانگریس منعقد ہوئی اور ورجینیا کے ایک باوقار زمیندار اور فوجی، جارج واشنگٹن، کو نو آبادیاتی افواج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ واشنگٹن شاید اپنے دور کا سب سے بڑا سپہ سالار نہیں تھا، مگر اس میں ایک ایسی ثابت قدمی تھی جس نے شکستوں کے باوجود اپنی فوج کو بکھرنے نہیں دیا۔
اسی دوران ایک اور شخص قلم اٹھا چکا تھا۔
اس کا نام تھامس پین تھا۔
1776ء کے آغاز میں اس نے ایک مختصر کتابچہ لکھا، "کامن سینس"۔ اس نے پہلی بار عام لوگوں کو سادہ زبان میں سمجھایا کہ مسئلہ صرف ٹیکس کا نہیں، بلکہ اس پورے نظام کا ہے جس میں ایک بادشاہ ہزاروں میل دور بیٹھ کر لاکھوں لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے۔ چند ہی مہینوں میں اس کتابچے نے عوامی رائے بدل دی۔
اب آزادی ایک خیال نہیں رہی تھی، ایک مطالبہ بن چکی تھی۔
جون 1776ء میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں تھامس جیفرسن، جان ایڈمز، بینجمن فرینکلن، راجر شرمن اور رابرٹ لیونگسٹن شامل تھے۔ اعلانِ آزادی کا مسودہ لکھنے کی ذمہ داری تھامس جیفرسن کو دی گئی۔ صرف تینتیس برس کا یہ نوجوان وکیل کئی دن تک ایک کمرے میں بیٹھا لکھتا رہا۔ اس نے صرف ایک سیاسی دستاویز نہیں لکھی، بلکہ ایسے الفاظ لکھے جنہوں نے دنیا کی سیاسی فکر کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔

اس اعلان میں لکھا گیا کہ تمام انسان برابر پیدا کیے گئے ہیں، اور انہیں زندگی، آزادی اور خوشی کے حصول جیسے بنیادی حقوق حاصل ہیں۔ حکومتیں عوام کی رضامندی سے وجود میں آتی ہیں، اور اگر وہ ان حقوق کی حفاظت نہ کریں تو عوام کو انہیں بدلنے کا حق حاصل ہے۔

4 جولائی 1776ء کو فلاڈیلفیا میں اسی اعلان کو منظور کیا گیا۔

اسی دن وہ دستخط ہوئے جنہوں نے ایک نئی قوم کو جنم دیا۔

لیکن آزادی کا اعلان، آزادی کی ضمانت نہیں تھا۔

اصل امتحان ابھی باقی تھا۔

جنگ کئی برس جاری رہی۔ برطانوی فوج دنیا کی بہترین فوجوں میں شمار ہوتی تھی، مگر نو آبادیاتی افواج کے پاس ایک چیز ایسی تھی جو کسی فوجی ساز و سامان سے زیادہ طاقتور ثابت ہوئی: اپنے مستقبل پر یقین۔ 1777ء میں ساراٹوگا کی فتح نے دنیا کو باور کرایا کہ یہ بغاوت شاید کامیاب بھی ہو سکتی ہے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب فرانس نے کھل کر امریکہ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔

فرانس کے بادشاہ لوئی شانزدہم نے صرف ہمدردی میں مدد نہیں کی تھی۔ وہ سات سالہ جنگ میں برطانیہ سے ہونے والی اپنی شکست کا حساب بھی برابر کرنا چاہتا تھا۔ فرانسیسی فوج، بحریہ، اسلحہ اور سرمایہ امریکی جدوجہد کے ساتھ آ کھڑے ہوئے۔ نوجوان مارکوئس ڈی لافائیت نے واشنگٹن کے ساتھ مل کر جنگ لڑی اور دونوں کے درمیان ایک تاریخی رفاقت قائم ہوئی۔

1781ء میں یارک ٹاؤن کا معرکہ فیصلہ کن ثابت ہوا۔ برطانوی جنرل کارنوالس نے ہتھیار ڈال دیے۔ اگرچہ امن معاہدہ دو سال بعد ہوا، مگر حقیقت میں سلطنت اسی دن جنگ ہار چکی تھی۔

1783ء کے معاہدۂ پیرس کے تحت برطانیہ نے امریکہ کی آزادی کو باضابطہ تسلیم کر لیا۔

مگر ایک ملک صرف آزادی سے نہیں چلتا۔

اسے آئین بھی چاہیے، ادارے بھی، قانون بھی۔

1787ء میں امریکہ کا آئین تشکیل دیا گیا۔ اختیارات کو مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ میں تقسیم کیا گیا تاکہ کوئی ایک فرد یا ادارہ مطلق العنان نہ بن سکے۔ دو برس بعد، 1789ء میں، جارج واشنگٹن متفقہ طور پر امریکہ کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ وہ بادشاہ بن سکتے تھے، مگر انہوں نے صدر بننا قبول کیا۔ شاید یہی فیصلہ نئی جمہوری ریاست کی سب سے بڑی اخلاقی بنیاد بن گیا۔

دو سو پچاس برس گزر چکے ہیں۔

اب نہ وہ کمرہ ویسا ہے، نہ وہ لوگ زندہ ہیں، نہ وہ سیاہی باقی ہے جس سے اعلانِ آزادی پر دستخط کیے گئے تھے۔ مگر ایک حقیقت آج بھی زندہ ہے۔

قومیں صرف جنگیں جیت کر پیدا نہیں ہوتیں۔

وہ اس دن جنم لیتی ہیں جب عام لوگ اپنے مستقبل کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کا حق مانگتے ہیں۔

شاید اسی لیے چار جولائی صرف امریکہ کا قومی دن نہیں، بلکہ اس خیال کی سالگرہ بھی ہے کہ طاقت کا اصل سرچشمہ تاج نہیں، عوام ہوتے ہیں۔

شاعری سچ بولتی ہے

غزل

نئے پرانے زخم کا حساب کون لکھے گا
مری بے باک زیست پر کتاب کون لکھے گا

فرشتۂ حساب تجھ کو نیند کیسے آ گئی
بتا مرے گناہ اور ثواب کون لکھے گا

اے مرغِ باغ ذکر کانٹوں کا نہیں کیا کرو
چمن کے پھولوں کا حسیں شباب کون لکھے گا

تمام رند پارسائی کی قسم اٹھا رہے
اے بادہ پیما اشکوں کو شراب کون لکھے گا

گھروں کو گھر کے ہی چراغ سے لگے گی آگ تو
یاں ننھے سے دیئے کو آفتاب کون لکھے گا

جو کوہِ کن سے تیشہ بھی طلب کرے گا عشق تو
واں جوئے شیر کا رواں حساب کون لکھے گا

یہ کس کا ہجر ہے شغف جو آج مجھ کو ڈس رہا
کہ شب گزیدہ دل کا یہ عذاب کون لکھے گا

پروین شغف
یو۔پی۔ بھارت

غزل

میرے گریے پہ سبھی لوگ خفا ہوتے ہیں
زخم رِستے ہیں تبھی درد سوا ہوتے ہیں

ہم کو کچھ کاتبِ تقدیر سے شکوہ ہی نہیں
دلِ حساس، رویوں سے فنا ہوتے ہیں

تپتے صحرا کی جلن اور آبلہ پائی
ہمنوا، ایسے میں رحمت کی گھٹا ہوتے ہیں

میرے ہونٹوں کا تبسم، میری آنکھیں ویران
ان کہے درد بہت سخت سزا ہوتے ہیں

تلاش میں تھی شفا کی، تبھی یہ عقدہ کھلا
کچھ مسیحا بھی تو مانندِ شفا ہوتے ہیں

کچھ اس انداز سے روندا کہ یہ دل ٹوٹ گیا
کرچیٔ دل میں نہاں، عکسِ وفا ہوتے ہیں

میرے مرنے پہ اے دہائیاں دینے والو
قرض زندوں کے بھی واجب ہیں، ادا ہوتے ہیں

میں ترکِ تعلق پہ رویا نہیں، کس کو خبر
میرے اندر کئی طوفان، بپا ہوتے ہیں

بساطِ عشق اس انداز سے بچھائی گئی
میں سمجھا ہار میں بھی، رنگِ وفا ہوتے ہیں

ظالمو اب بھی نہ رویا تو میں مر جاؤں گا
ضبط کے پہرے، کب اس دل کی دوا ہوتے ہیں

وفا کی راہ سے گذرا تو یہ جانا میں نے
نارسائی کے دکھ، چاہت کی بقا ہوتے ہیں

سارہ سید

غزل

اپنے اغراض و مقاصد کی طرف لوٹے ہیں
آج کچھ لوگ مساجد کی طرف لوٹے ہیں

آج پھر دشتِ خرابات میں گونجی ہے اذاں
آج ہم اپنے معابد کی طرف لوٹے ہیں

ہم سے کافر بھی نظر آئے صراط حق پر
تین سو ساٹھ سے واحد کی طرف لوٹے ہیں

آنکھ ملتا ہُوا نکلا ہے سحر کا سورج
مے کدے سے ابھی مسجد کی طرف لوٹے ہیں

کیسے ہوتی ہے غزل "قابلِ گردن زدنی"
"نیم وحشی" کے مقلد کی طرف لوٹے ہیں

آپ ہی دیتے ہیں اب اپنا تعارف الفاظ
جب سے ہم روئے قواعد کی طرف لوٹے ہیں

آج ہونی ہے حقیقت میں ادب کی تخلیق
آج ہم پاس سے ناقد کی طرف لوٹے ہیں

سیکھنے کے لئے اندازِ تکلم تابش
غزلیات کے موجد کی طرف لوٹے ہیں

تابش ردولوی

غزل

سماعتوں میں کوئی گھول دے نوائے جنوں
فقیر دینے لگا ہے ہمیں دعائے جنوں

کہیں نہ باغِ بہاراں نہ کوئی رنگِ طرب
یہ دشتِ عشق ہے، چلتی ہے یاں ہوائے جنوں

بچھڑتے وقت تری یاد کے جزیروں سے
گلی گلی ہمیں دیتی رہی صدائے جنوں

یہ شاہ راہِ وفا ہے مرے شریکِ سفر
ہر ایک شخص کے پیچھے ہے یہ بلائے جنوں

ہم ایسے سرد رویوں کے مارے لوگ *حرا*
گلیم چھوڑ کے اوڑھے رہے قبائے جنوں

حرا قاسمی